

سفر کی شام
پاک سوسائٹی
فرحت اشتیاق
ڈاٹ کام

فرحت اشتیاق



مکمل ناول

اور اس دن وہ بہت اچھی لگنا چاہتی تھی، اسی لیے بیوی
پارلر جانے کے ارادے کو وہ اس دن تک ٹالتی رہی
تھی۔

پارلر سے فارغ ہونے کے بعد اسے کچھ خریداری
کرنا تھی، چند ایک تو گھر کے روزمرہ استعمال کی اشیا
تھیں، خاص طور پر اسے پائن اپیل کاٹن پیک اور
فریش کریم خریدنی تھی۔ باقی کیک بنانے کے تہ
لوازمات گھر پر موجود تھے۔ سرخ گلابوں کا ایک خوب
صورت سا گلدستہ خرید کر اس نے اپنی خریداری مکمل
کی اور پھر اپنے اپارٹمنٹ کا رخ کیا۔

وہ سولہ فروری کی ایک خوب صورت دوپہر تھی
اور اس دوپہر وہ آفس سے کنج ٹائم ہی میں نکل آئی تھی۔
اس کی پہلی منزل بیوی پارلر تھی، جہاں اسے اپنے بالوں
کی کٹنگ کروانی تھی۔ پارلر میں زیادہ دیر رکھنے کا اس
کے پاس وقت نہیں تھا، اسی لیے فیشل کے ارادے کو
اس نے ملتوی کر کے گھر پر خود ہی کلیمنزنگ کرنے کا
فیصلہ کر لیا۔ اس کے بال پچھلے دو ماہ سے توجہ چاہ رہے
تھے اور وہ وقت نہ ملنے کے سبب اسے ٹالے چلی جا رہی
تھی۔ حمیر بھی دو تین بار اسے ٹوک چکا تھا۔ سولہ
فروری کا دن اس کی زندگی کا سب سے اہم ترین دن تھا

یاد تھا یا نہیں، وہ وقت پر گھر واپس آ رہا تھا یا نہیں،
بہر حال اسے تو اپنی تیاری مکمل رکھنا تھی۔

ڈائمنگ نیبل پر رکھے گلدان میں اس نے اپنے
خرید کر لائے ہوئے تازہ سرخ گلاب سجائے پورے
اپارٹمنٹ میں ایئر فریشنر اسپرے کیا۔

حمیر کے لیے تحفہ اس نے کافی دن پہلے ہی خرید لیا
تھا۔ وہ کوئی بھی معمولی چیز استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس
کے معیار کے حساب سے یہ انتہائی قیمتی رسٹ وائچ
خریدنے میں اس کی تمام تر بچت اور اس مہینے کی پوری
تنخواہ ٹھکانے لگ گئی تھی مگر پھر بھی وہ بہت خوش تھی۔
اگر وہ کوئی عام سی گھڑی اسے تحفے میں دیتی تو بخوشی قبول
تو وہ اسے بھی کر لیتا، اس کا دل رکھنے کی خاطر دو تین بار
پہن بھی لیتا اور پھر اس کے بعد واپس اپنی پرانی قیمتی
گھڑی پر آجاتا اور وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ گریننگ
کارڈ نکھٹے۔ کے بعد اس نے گھڑی کا کیس اور کارڈ اپنی

ڈرائنگ نیبل پر ہی رکھ دیا اور پھر اپنی تیاری شروع کی۔
سیاہ رنگ کی نیٹ کی ساڑھی اس کے نازک
سراپے پر بہت سج رہی تھی۔ ساڑھی کے پلو پر سلور
نگوں اور موتیوں کا بڑا نفیس کام بنا ہوا تھا۔ اس کام کی
مناسبت سے اس نے جیولری بھی سلور پہنی۔ خوب
اہتمام سے بھرپور میک اپ کیا، جبکہ روز تو بس بھاگتے
ووڑتے لپ اسٹک لگانے ہی کا وقت مل پاتا تھا۔ آئی
لائنر، مسکارا اور آئی شیڈو کے بعد اس کی خوبصورت
پراؤن آنکھیں مزید خوب صورت اور دلکش لگنے لگی
تھیں۔ پرفیوم لگانے کے بعد اس نے خود پر ایک
آخری نگاہ ڈالی اور پھر مطمئن ہوتے ہوئے ڈرائنگ
نیبل کے سامنے سے ہٹ گئی۔ وہ آج اسے اس روپ
میں دیکھ کر کیا کہے گا؟ کتنے دنوں بعد وہ اتنے اہتمام سے
تیار ہوئی ہے۔

”مومی! جلدی گھر آ جاؤ۔“ اس کی تعریفیں سننے کی
اسے بہت بے تابی تھی وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔
اپنے بیڈروم میں بے چینی سے ادھر سے ادھر ٹھکتے
ہوئے وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ساڑھے سات بجے

ان کا اپارٹمنٹ تیسری منزل پر تھا۔ اس پوش
علاقے میں دو کمروں کے اس اپارٹمنٹ کا انہیں اتنا
کرایہ دینا پڑ رہا تھا جتنا کسی ٹڈل کلاس علاقے میں چار
پانچ کمروں کے مکان کا بھی نہیں ہو گا۔ لفٹ میں اس
کی مسز یونس سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے ہائے ہیلو
کے فوراً بعد بے ساختہ اس کے بیز اسٹائل کی تعریف کی۔
اس نے مسکراتے ہوئے ان کی تعریف کا شکریہ ادا کیا
اور لفٹ سے نکل آئی۔ اپنی تعریف انسان کو ہمیشہ ہی
اچھی لگتی ہے۔ اسے بھی لگی تھی مگر یہ وہ تعریف نہیں
تھی جس کا اسے بے چینی و بے صبری سے انتظار تھا،
جس کے لیے آج وہ بہت اچھی لگنا چاہتی تھی، اسی کے
منہ سے اپنی بے تحاشا تعریفیں بھی سنا چاہتی تھی۔

اپارٹمنٹ کے اندر آتے ہی اس نے مسینی رفتار
سے اپنا کام شروع کیا۔ جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر کیک
بنانے کی تیاری شروع کی۔ کیک کی تیاری کے دوران
ہی اس نے اپنے لیے ایک چیز سینڈوچ بنایا اور چلتے
پھرتے اسے کھا کر لچ کر لیا۔ کیک اوون میں رکھنے کے
بعد اس نے پہلے ہی سے صاف گھر کو مزید صاف کرنا
شروع کیا۔ اس کے گھر کی صفائی، نفاست اور سجاوٹ کو
دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ اس گھر کی مالکن
ایک ورکنگ وومن ہے جو صبح آٹھ بجے گھر سے نکل کر
شام چھ بجے گھر واپس آتی ہے۔ اس کام کو نمٹا کر وہ
ایک مرتبہ پھر پورے انہماک سے کیک کی جانب متوجہ
ہوئی۔

حمیر کی واپسی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اگر کسی میٹنگ میں
یا کسی اور جگہ مصروف نہ ہو گیا ہوتا تو وہ آٹھ بجے تک
گھر واپس آ جاتا تھا مگر ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ اور اگر آج
کا دن اسے یاد نہیں تھا تو پھر تو جلدی واپسی کا کوئی امکان
ہی نہیں تھا۔ پچھلے سال کے تجربہ کو سامنے رکھتے
ہوئے قوی امید یہی تھی کہ اسے یاد نہیں ہو گا، اگرچہ
کہ صبح اس نے قصداً ”حمیر سے“ آج کیا تاریخ ہے؟“
پوچھا تھا اور اس نے اپنی شرٹ کے بٹن بند کرتے
ہوئے فوراً ”جواب میں اسے تاریخ بتادی تھی۔ اسے

پر بات کر لینے کے بعد جہاں یہ تسلی ہو گئی تھی کہ وہ کھیل ختم کر کے جلدی گھر واپس آ رہا ہے وہیں یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ مسٹر بھلکڑا ایک مرتبہ پھر اپنی ویڈنگ اینورسری بھول گئے ہیں۔ بجائے اس سے خفا ہونے کے اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

وہ دونوں بعض معاملات میں ایک دوسرے سے کتنے مختلف تھے۔ وہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں، چھوٹی چھوٹی باتوں کو یاد رکھنے والی اور وہ ان سب کو بھول جانے والا، لیکن جب درمیان میں محبت ہوتی ہے پھر کسی بھی فرق کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ وہ دونوں کو یاد نہیں رکھتا تو کیا ہوا، وہ اس سے محبت تو بے پناہ کرتا ہے۔ اس کی نگاہ دیوار پر فریم میں جڑی اپنی شادی کے دن کی تصویر پر گئی۔ وہ اور حمیرا دونوں ساتھ مسکراتے ہوئے سولہ فروری کے دن ٹھیک دو سال پہلے حمیرا رضا اس کی زندگی میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی اور کبھی ختم نہ ہونے والی ہنسی بن کر داخل ہوا تھا۔ وہ اس کی زندگی کا سب سے اہم شخص تھا۔ اس کے

ی اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے اس کے موبائل پر کال کر ڈالی۔

”حمیرا! تم کہاں ہو؟“ اس کے کال ریسیو کرتے ہی وہ سلام دعا کے بغیر بے صبری سے بولی۔

”مائی سویٹ وائف! میں اس وقت ارسلان صاحب کے ساتھ اسکواش کھیل رہا ہوں اور آج انہیں ہر اے بغیر گھر واپس نہیں آؤں گا۔“ وہ ہنستے ہوئے جواباً بولا، پھر جیسے ایک دم ہی اس کے بے صبری سے بھرپور جملے پر دھیان گیا تو چونک کر پوچھنے لگا۔

”سب خیریت تو ہے، کوئی پر اہلم ہے کیا؟“

”میری سب سے بڑی پر اہلم یہ ہے کہ اس وقت میرے شوہر صاحب کو میرے پاس موجود ہونا چاہیے اور وہ نہیں ہیں۔ میں تمہارے اسکواش و سکواش کو بالکل نہیں جانتی، بس تم فوراً گھر واپس آ رہے ہو۔“ وہ اکیسویں صدی کی ایک ماڈرن لڑکی ہونے کے باوجود

انداز سے ایک مکمل مشرقی بیوی تھی۔ شوہر کی ہاں میں ہاں ملانے والی، اس کے کیے گئے فیصلوں کو بغیر کسی اعتراض کے قبول کرنے اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے والی۔ پر آج کی اپنی یادگار شام کو وہ ضائع ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی، اسی لیے یوں من مانی کرنے والے انداز میں اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

”ہا! میں اس طرح کھیل ادھورا چھوڑ کر واپس نہیں آ سکتا۔ یہ گیم ختم کر لوں پھر میں فوراً گھر آتا ہوں، اوکے۔“ اس کے غیر معمولی ضدی لہجے نے اس سے کھیل جلدی ختم کر لینے اور گھر واپس آنے کا وعدہ کر دیا تھا، ورنہ وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ ارسلان ایاز سے دوستی حمیرا کے لیے کتنی اہم ہے۔ وہ ایک بے مثال اور شاندار کیریئر رکھنے والے سینئر بینکر تھے۔ اسکواش کے حوالے سے ہی حمیرا کی ان سے دوستی ہوئی تھی اور حمیرا اس دوستی کو ہر ممکن حد تک آگے لے جانا چاہتا تھا۔ اکثر ہفتے میں تین یا چار مرتبہ وہ ارسلان ایاز کے ساتھ اسکواش کھیلنے چلا جاتا تھا۔ فون

ان لوگوں کو ڈیڑھ پونے دو سال بعد بھی اس بندے کو بھلانے نہیں دیا تھا۔

اس گرم ترین دہرے میں جب وہ ڈاکٹر اعجاز ارشد کے پرسکون ماحول والے ایئر کنڈیشنڈ آفس میں داخل ہوئی تو وہ ان کی میز کے سامنے رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا ان سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے کاشن کا بلیک ٹراؤزر اور بلیو بلیک اسٹرائپس کی ہاف سلیوز کی قمیض کے ساتھ بلیو کلر کی ٹائی پہن رکھی تھی اور ماہاجر علی کو یہ تسلیم کر لینے میں قطعاً کوئی تامل نہیں تھا کہ وہ بندہ واقعی بہت ہنڈ سم تھا۔ اس کی ڈریسنگ اس کے بیٹھنے اور بولنے کا انداز سب شاندار تھی۔ وہ ڈاکٹر اعجاز سے اپنی ریسرچ رپورٹ کے متعلق کچھ باتیں پوچھنے آئی تھی مگر وہ فی الحال مصروف نظر آ رہے تھے۔

”سر! میں بعد میں آ جاؤں گی۔“ مگر ڈاکٹر اعجاز نے اسے روک لیا تھا۔ لہذا وہ حمیر کے برابر والی کرسی چھوڑ کر اس سے اگلی کونے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر اعجاز اس کی محنت اور لگن سے بہت خوش تھے اس لیے جس وقت بھی کچھ پوچھنے ان کے پاس آتی وہ بخوش اسے وقت دیتے۔ اسے ان سے جو کچھ پوچھنا تھا وہ پوچھ رہی تھی اس دوران وہ بندہ اس سے اور ڈاکٹر اعجاز سے قطعاً لا تعلق سامنے شیفت میں لگی کتابوں پر نظریں جمائے بیٹھا رہا تھا۔ اس کے کسی بھی انداز سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس کے سوالات اور ڈاکٹر اعجاز کے جوابات میں ذرا سی بھی دلچسپی لے رہا ہے۔ اس کا لا تعلق سے بھرپور انداز کسی حد تک مغروریت کا حامل تھا۔ مگر پھر سجانے کیوں اس نے سامنے شیفت اور کتابوں سے نگاہیں ہٹا کر ڈاکٹر اعجاز اور اسے دیکھنا شروع کر دیا اور پھر غیر محسوس انداز میں وہ ان کے ڈسکشن میں شریک ہو گیا۔ وہ بڑی روائی دلچسپی سے ان موضوعات پر بول رہا تھا بلکہ ڈاکٹر اعجاز بھی وہ زیادہ بولنے نہیں دے رہا تھا۔

ابھی وہ چند مزید سوالات ڈاکٹر اعجاز سے کرنا چاہتی تھی کہ ڈپٹی ڈائریکٹر کے آفس سے ان کا بلاوا آ گیا۔ ”آئم سوری۔“ وہ ان دونوں سے معذرت کرتے

بغیر زندہ رہنے کا وہ تصور تک نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ہر بل اس کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے حواسوں پر وہ یوں چھایا تھا کہ اسے اس کے سوا دنیا میں کسی اور رشتے کی کوئی کمی محسوس ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے سر پر باپ کی محبت و شفقت بھری چھاؤں نہیں، بہن، بھائیوں کا پیار بھرا ساتھ نہیں اور ماں۔۔۔ وہ ہوتے ہوئے بھی اس کے پاس نہیں۔ تو کیا ہوا، وہ ایک شخص حمیر رضا تو تھا نا اس کے پاس ہر دم اس کے ساتھ۔ زندگی سے کبھی کوئی شکوے اگر رہے بھی تھے تو دو سال پہلے حمیر رضا کے ساتھ اس پیار بھری نئی زندگی کی شروعات کرنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے تھے۔



وہ حمیر رضا سے پہلی بار ڈاکٹر اعجاز ارشد کے آفس میں ملی تھی۔ پہلی بار یوں کہ اس روز پہلی مرتبہ اس کے اس سے گفتگو ہوئی تھی ورنہ سرسری سا جانتی تو وہ اسے پہلے بھی تھی۔ جب وہ ایم بی اے کرنے کے لیے آئی بی اے میں داخل ہوئی تب حمیر رضا وہاں سے پاس اوٹ کرنے والا تھا۔ وہ اپنے تیج — کے ٹاپ تھری اسٹوڈنٹس میں سے ایک تھا اور ان دنوں وہ انسٹی ٹیوٹ میں اس حوالے سے کافی مشہور ہو گیا تھا کہ اپنے آخری سمسٹر کے دوران ہی اسے تین بہت بہترین جگہوں سے جاب کی آفرز آچکی تھیں۔ ان آفرز میں سے ایک آفر اس غیر ملکی ادارے سے بھی تھی جہاں سے اس نے انٹرن شپ کی تھی۔ کچھ لوگ اس سے حسد کرتے تھے اور کچھ رشک۔ بہر حال اس کا ذکر اکثر اسٹوڈنٹس کرتے تھے مگر ڈاکٹر اعجاز ارشد کا وہ خاص طور پر بہت پسندیدہ تھا۔ فوراً ہی سمسٹر میں اب جب ڈاکٹر اعجاز ان لوگوں کو پڑھا رہے تھے وہ اس کی کسی نہ کسی خوبی کا ذکر ضرور ہی کیا کرتے تھے۔ اسے انسٹی ٹیوٹ سے گئے ڈیڑھ سال ہو چکا تھا اور وہ کہتے تھے کہ وہ ان اسٹوڈنٹس میں سے تھا جنہیں پچیس تیس سال بعد بھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ یوں ڈاکٹر اعجاز ارشد نے

پہلے کہ وہ اس کی ممی اور بہن بھائیوں کی طرف آتا وہ وہاں سے اٹھ جانا چاہتی تھی۔

”آپ کا بہت شکریہ آپ نے بہت ساری انفارمیشن مجھے دی۔“ اسے مزید کوئی فقرہ بولنے کا موقع دے بغیر وہ ”اللہ حافظ“ کہتی ڈاکٹر اعجاز کے آفس سے باہر نکل آئی تھی۔ اس واقعہ کا ذکر کسی اور سے تو کیا اس نے کلثوم عدنان جیسی اپنی قریبی دوست تک سے نہیں کیا تھا۔

مگر اگلے روز جیسے ہی وہ انسٹی ٹیوٹ پہنچی وہ بندہ ایک مرتبہ پھر اس کے سامنے آگیا اور تب کو ریڈور میں طوبی وغیرہ کے گروپ کے ساتھ کھڑی کلثوم اور صنم نے بھی اسے اس سے بات کرتے دیکھ لیا تھا۔

”السلام علیکم مس ماہا احمد علی۔“ وہ اپنی شاندار شخصیت کے سحر کے ساتھ صبح سویرے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”وعلیکم السلام۔“ اس نے اپنے لہجے میں کل کے برخلاف سختی اور روکھا پن شامل کر لیا تھا۔

”کیسی ہیں آپ؟“

”میں ٹھیک ہوں، آپ صرف میری خیریت معلوم کرنے صبح صبح کیمپس آئے ہیں؟“ اس کے قدرے بد لحاظی کا عنصر لیے ہوئے جواب پر وہ محظوظ ہو جانے والے انداز میں بے ساختہ ہنسا۔

”بینکنگ اسٹوڈنٹس فورم نے آج یہاں ایک سیمینار اریج کیا ہے میں وہ اٹینڈ کرنے آیا ہوں۔“ وہ جلد بازی میں منہ سے نکل جانے والے اس فقرے پر دل ہی دل میں بری طرح شرمندہ ہوئی اور وہ اس کی شرمندگی کو محسوس کرتے ہوئے کچھ ذمہ معنی لہجے میں مسکرا کر بولا۔

”ویسے سیمینار دس بجے شروع ہوگا، میں واقعی جلدی آگیا ہوں۔“

یہ آپ کا آخری سمسٹر ہے؟“ وہ سامنے سے ہٹنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

اس نے صرف اثبات میں گردن ہلادی۔ وہ اس کی ناگواری اس کی عجلت اور بیزاری کو جیسے سمجھ ہی نہیں

ہوئے اٹھے تو حمیرا سنجیدگی سے ان سے بولا۔

”میرا خیال ہے ان کے ان سوالات کے جواب تو میں بھی دے سکتا ہوں۔“ وہ جواباً ”کھل کر مسکرائے۔“

”بالکل دے سکتے ہو۔ ایک بینکر ان سوالات کے

تسلیم بخش جواب نہ دے سکے تو کون دے گا۔ ماہا! آپ

حمیرا سے پوچھ لیجئے جو پوچھنا ہے، میں ابھی آتا ہوں۔“

وہ اپنے آفس سے نکل گئے تھے اور وہ جو ڈاکٹر اعجاز کو

انتہادیکھ کر خود بھی فوراً ”اٹھنا چاہتی تھی مجبوراً“ وہیں

بیٹھی رہی۔ جو باتیں اس نے ڈاکٹر اعجاز کے اٹھ کر

جانے سے پہلے ان سے پوچھی تھیں ان کے وہ بڑے

تفصیلی جوابات دے رہا تھا۔ وہ تفصیلات اس کے لیے

فائدہ مند تو تھیں، لیکن وہ دل ہی دل میں مسلسل یہ

سوچے چلی جا رہی تھی کہ کیا اس بندے کو اپنا کچھ کام

وام نہیں ہے جو اتنی فرصت سے بیٹھا ہوا اسے

سمجھا رہا ہے۔

”آپ کہاں رہتی ہیں مس ماہا؟“ اس نے اچانک

بڑی سنجیدگی و بردباری سے اس سے یہ سوال پوچھا۔

اس نے چونک کر اسے دیکھا، وہ اس کی فائل پر کچھ

لکھنے میں اس طرح مصروف تھا جیسے یہ سوال یونہی

سرسری سے انداز میں گفتگو برائے گفتگو کے طور پر

پوچھ لیا ہو۔

”اپنے گھر میں۔“ اس کا دل یہی جواب دینے کو چاہا

تھا۔ اس نے سنجیدگی سے اپنی رہائش کے متعلق

تعلیم وہ اب وہاں سے اٹھنا چاہ رہی تھی۔

”آپ کے والد کیا کرتے ہیں؟“ کچھ دیر کام کی بات

کرنے کے بعد پھر ایک غیر متعلقہ سوال اس سے پوچھا

گیا تھا۔ وہ پاگل نہیں تھی جو ان سوالات کا مقصد نہ

سمجھ پاتی۔ اسے اندر ہی اندر اس بندے کا خود اعتمادی

سے بھرپور ذاتیات کی طرف آنے والا یہ انداز بہت برا

لگتا تھا مگر وہ براہ راست اپنی ناگواری کا اظہار نہیں

ہوتی تھیں۔



وہ فقط چھ سال کی تھی جب ایک ایکسڈنٹ میں اس کے پیلا اسے اور ممی کو چھوڑ کر اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئے تھے۔ اس کے پیلا کی بہت لمبی چوڑی جائیداد تو نہیں تھی، البتہ اتنا پیسہ چھوڑ کر ضرور گئے تھے کہ وہ دونوں ماں بیٹی عزت کی زندگی جی سکیں۔ پھر بھی تنہا تو وہ نہیں رہ سکتی تھیں۔ اس کی ممی اسے لے کر واپس اپنے میکے آگئی تھیں۔ ممی صرف چھ سات مہینے ہی وہاں اس کے ساتھ رہی تھیں پھر تانا اور تانی نے ان کی دوسری شادی کروادی تھی۔ ممی رخصت ہو کر مظهر آصف جو ان کے فرسٹ کزن بھی تھے، ان کے گھر چلی گئیں اور وہ اپنے انھیال میں رہ گئی۔

مظہرانگل کی پہلی بیوی کا دوسرے بچے کی پیدائش کے وقت انتقال ہو گیا تھا۔ وہ بہت چھوٹی تھی اس کے لیے اس بات پر سمجھوتا کرنا مشکل تھا کہ اس کا پیار سا ماں گھر اور اس کے پیلا اس سے چھن گئے ہیں اور ممی بھی اسے چھوڑ گئیں۔ شروع شروع میں وہ بہت روئی، اس نے ماں کے پاس جانے کی بہت ضد کی مگر پھر گزرتا وقت اس میں صبر پیدا کرتا چلا گیا۔ ممی میکے آئیں تو اسے بہت پیار کرتیں، اس کے لیے کھلونے اور چاکلیٹس لاتیں اور اگر مظہرانگل بھی ساتھ ہوتے تو اسے کبھی بھی اس طرح پیار نہ کرتیں جس طرح اکیلے آنے پر کرتی تھیں۔ اس سے زیادہ پیار تو وہ مونا جو ان کی سگی بیٹی بھی نہیں تھی اس سے کرتی نظر آتی تھیں۔ پھر ان کی گود میں عبداللہ آگیا۔ مونا سے اگر وہ صرف مظہرانگل کی خاطر دکھاوے کا پیار کرتی تھیں تو عبداللہ تو ان کا سگا بیٹا تھا جس سے وہ والہانہ پیار کرتیں۔

اس کے دل میں ماں کے خلاف بہت سا غبار اور غلط فہمیاں پلتی چلی گئیں۔ یہ غلط فہمیاں اور بد گمانیاں اس وقت مزید شدت اختیار کر لیتیں جب ممائی یا ان کا کوئی بچہ اسے یہ احساس دلاتا کہ یہ اس کا گھر نہیں۔ وہ

چودہ سال کی تھی جب آگے پیچھے تانا اور تانی دونوں کا انتقال ہو گیا اور ماموں، ممائی نے ممی سے صاف صاف یہ بات کی کہ پرانی اولاد وہ بھی لڑکی کی ذمہ داری اٹھانے کو وہ تیار نہیں، لہذا وہ اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ لے جائیں ممی کے چہرے پر یہ بات سننے ہی پریشانی پھیل گئی تھی۔ اسے اس وقت اپنا آپ بڑا حقیر اور بے مقصد لگا تھا۔ وہ بہ حالت مجبوری اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لائی تھیں اور اسے دیکھتے ہی مظہرانگل کا منہ بن گیا تھا۔ وہ کئی دنوں تک ممی سے بھی اس بات پر ناراض رہے تھے اور ممی ان کے آگے پیچھے انہیں منانے کے جتن کرتی ماہا کی شرمندگی اور ندامت کو دو چند کر دیا کرتیں۔ ماں کے خلاف جو وہ دل میں غلط فہمیاں، نفرتیں اور بد گمانیاں رکھتی تھی اچانک ہی ان سب کی جگہ ترس اور ہمدردی نے لے لی۔ اسے اس عورت پر ترس آنے لگا اور خود پر غصہ۔ وہ اپنی ماں کی پرسکون اور خوشگوار ازدواجی زندگی میں زہر گھولنے کا باعث بن رہی تھی۔ چاہے یہ حقیقت جتنی بھی تلخ اور ناقابل قبول تھی لیکن اپنی ممی کے اس گھر میں آنے کے صرف ایک گھنٹے کے اندر ہی اس نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ اس کی ماں کی زندگی میں اب اس کی کوئی جگہ نہیں۔

مظہرانگل، مونا اور عبداللہ تینوں میں سے کوئی اس سے بات نہیں کرتا تھا اور ممی صرف اس وقت بات کرتیں جب مظہرانگل آفس گئے ہوتے۔ اس کے تعلیمی اخراجات، اس کے لباس اور دیگر بنیادی ضروریات ابھی بھی اس کے پیلا ہی کے پیسوں سے پوری ہوتی تھیں پھر بھی مظہرانگل کو ایسا لگتا جیسے وہ ان کے بچوں کا حق چھین کر کھا رہی ہے۔ وہ اسکول سے دیر سے آتی تھی تب تک وہ سب کھانا کھا چکے ہوتے تھے۔ مونا کچن میں اس کے کھانے کے لیے کوئی چیز نہیں چھوڑتی تھی۔ وہ بچا ہوا کھانا فریزر میں ڈال دیتی، ماسی کو دے دیتی اور کچھ نہ ہوتا تو اپنی پالتوبلی کے آگے ڈال دیتی۔ یہ اس کا گھر نہیں تھا۔ جو وہ اس نا انصافی پر کسی سے احتجاج کرتی۔ وہ لباس تبدیل کر کے خاموشی سے ٹینک کے پاس والی جگہ پر اسکول کا کام

ہیں وہ IBA میں ان کی بیٹی سے سینئر تھا۔ اپنے بھائی کے متعلق مزید تفصیلات جب حمیر کے بھائی نے ممی کے گوش گزار کیں تو ان کے چہرے کے تاثرات ہی تبدیل ہو گئے۔ وہ ماہا کی شادی جلد از جلد کر دینا چاہتی تھیں اور اس کے لیے انہیں رشتے کی بھی تلاش تھی۔ مگر وہ ان کی اولاد تو تھی نا، جلدی کی خواہش رکھنے کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتی تھیں کہ اس کی شادی کسی اچھی جگہ ہو اور یہ تو واقعی ایک بہترین رشتہ نظر آ رہا تھا۔

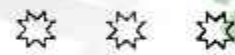
جو اور رضا، حمیر کی تصویر اور اس کا وزٹنگ کارڈ انہیں دے گئے تھے اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ گئے تھے کہ وہ یہ رشتہ جلدی طے کر دینا چاہتے ہیں۔

مظہر انکل جنہوں نے اس کے رشتے کے لیے آنے والوں سے ملنا پسند نہیں کیا تھا انہوں نے رات کے کھانے پر ممی سے اس بارے میں پوچھا ضرور تھا۔ اور ممی نے جیسے ہی انہیں حمیر کے متعلق تمام تفصیلات بتائیں اس نے ان کے چہرے پر جلن اور حسد جیسے تاثرات دیکھے۔ اسے ان کے چہرے پر دکھائی دیتی جیسی سے دکھ پہنچا تھا اتنے برسوں میں انہیں اس سے اتنی سی بھی انسیت نہیں ہو سکی تھی کہ اس کی کسی خوشی پر خوش ہو سکیں؟

ممی تو اس کی شادی کل کی کرتی آج کرویتیں پھر یہ تو ایک بہترین رشتہ تھا۔ انہوں نے حمیر کے بارے میں کسی بھی طرح کی کوئی انکوائری یا معلومات کروائے بغیر بس ایک دفعہ اس کے گھر جا کر اس سے ملنے کے بعد اس رشتے کے لیے ہاں کہہ دی۔

باقاعدہ کوئی منگنی نہیں ہوئی تھی بس بات پکی کر کے شادی کی تاریخ طے کر لی گئی تھی۔ اسے بہت عجیب عجیب سے خیال آتے، اسے آنے والے وقت سے بہت ڈر لگتا، وہ کیسا تھا، وہ کس طرح کی عادتوں کا مالک تھا، وہ کچھ بھی تو نہیں جانتی تھی۔ ڈاکٹر اعجاز جس لڑکے کی ذہانت کے قصے ہمہ وقت سناتے تھے کیا ضروری تھا کہ وہ عادتوں اور مزاج میں بھی اچھا ہوتا؟ بات طے ہو جانے کے بعد حمیر نے صرف ایک

کرنے بیٹھ جاتی اور وہیں پر پڑھتے پڑھتے سو بھی جاتی۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ ماں کی طرف سے یا کسی بھی طرف سے کسی بھی توجہ کے بغیر اس کے امتحانی نتائج ہمیشہ شاندار ہوتے۔ مونا کو تو پر بھائی کا زیادہ شوق تھا ہی نہیں۔ مگر عبد اللہ جس پر ممی اور مظہر انکل دونوں بھرپور توجہ دیتے۔ وہ بھی کسی غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر رہا تھا۔ مظہر انکل کو اس کی اعلیٰ تعلیمی کارکردگی بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔ مونا کی پر بھائی سے اتنی لا تعلقی اور غیر دلچسپی کو دیکھتے ہوئے مظہر انکل نے انٹر کرتے ہی اس کی شادی کر دی تھی۔ مونا کی شادی سے اسے یہ فائدہ ہوا تھا کہ لاؤنج میں سونے اور گھر کے پچھلے کونے میں یکسوئی سے پڑھنے کے بجائے اب اسے ایک کمرہ مل گیا تھا لیکن وہ اندر سے جانتی تھی کہ نہ یہ کمرہ اس کا ہے اور نہ یہ گھر۔



حمیر کے بھائی اور بھابھی اگلے روز شام کو ان کے گھر آئے تھے۔ وہ ممی کو یہ تو بتا چکی تھی کہ وہ اس کا کلاس فیلو نہیں بلکہ اس سے سینئر تھا چھٹی کا دن تھا، مظہر انکل گھر پر ہی موجود تھے مگر انہوں نے ڈرائنگ روم میں آکر مہمانوں سے ملنا پسند نہیں کیا تھا، وہ کون سا ان کی سگی بیٹی تھی جو اس کے لیے آنے والے کسی رشتے میں وہ دلچسپی لیتے۔ حمیر کے بھائی اور بھابھی اس کے تصور کے بالکل برعکس تھے۔ اس کے بھائی صرف شکل میں اس سے ملتے تھے ورنہ ان کی کوئی چیز ایسی نہیں تھی جو یہ ظاہر کرتی کہ وہ حمیر کے بھائی ہیں۔ وہ اپنی گفتگو ہی سے واجبی سے پڑھے ہوئے معلوم ہو رہے تھے اور ان کی بیگم ان سے بھی زیادہ کم تعلیم یافتہ اور عام سی تھیں۔ اس کے بھائی کی مردانہ کپڑے کی دکان تھی۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ الگ رہتے تھے، ان کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ بس دو ہی بھائی تھے۔ وہ حمیر سے عمر میں کافی بڑے تھے۔ ممی کے چہرے پر انہیں دیکھ کر تو کوئی متاثر ہونے والے تاثرات آنہیں سکتے تھے مگر وہ یہ تو جانتی تھیں کہ جس کے لیے وہ آئے

مرتبہ اس سے فون پر رابطہ کیا تھا اور اس میں بھی ان دونوں کی بہت مختصر بات ہوئی تھی۔
 ”اب تو یقین آگیا کہ جس لڑکی کا راستہ میں نے کیسپس میں روکا تھا میں اس کے ساتھ وقت نہیں بلکہ اپنی پوری زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔“

”آپ نے مجھے، میرا مطلب اتنا بڑا فیصلہ، آپ میرے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتے پھر یہ سب۔“ وہ اس کی شوخی کے جواب میں سنجیدگی سے بولی۔

”اس سوال کا جواب دینے کے لیے مجھے جو کچھ کہنا پڑے گا، وہ ابھی کہنا مناسب نہیں۔ اس سوال کا جواب میں تمہیں ۲۴ فروری کو اپنے گھر میں۔ سوری تب تو وہ ہمارا گھر ہو چکا ہو گا تو میں ہمارے گھر میں ۲۴ فروری کو تمہیں تمہارے سوال کا جواب دوں گا۔“ وہ بے تکلفانہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا اور وہ اس مختصر سی بے تکلفانہ گفتگو کے بعد بھی اپنے اندر کے ڈر اور خوف کو دور نہیں کر پائی تھی۔

وہ زندگی میں تیسری بار ایک گھر کو چھوڑنے والی تھی جس گھر میں اب وہ چار ہی تھی کیا وہ گھر واقعی اس کا گھر ہو گا؟ کیا وہ شخص واقعی ویسا ہو گا جیسا دکھتا ہے؟ آگے کیا ہونے والا تھا اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ بس ایک جوا کھیل رہی تھی اور اگر وہ سب کچھ ہار گئی تو اس کے پاس تو پیچھے پلٹ کر دیکھنے پر میکے نام کا آسرا بھی نہیں ہو گا۔

اس کی شادی کی تقریبات میں مہندی، مایوں کچھ نہیں ہوا تھا۔ اگر وہاں حمیرا ان رسومات کے خلاف تھا تو یہاں اتنا فالتو پیسہ کسی کے پاس نہیں تھا کہ ان اللوں تللوں میں خرچ کرتا۔

تعلیم حاصل کرنے کے بعد اتنے ہی پیسے بچے تھے کہ اس کی اس عام سے انداز میں شادی ہو سکے۔ بہت عام سا بی اس کا جینز تھا۔ شادی ہو جانے کے بعد اب پیچھے اگر ماں اور اس کا گھر نہیں تھا تو باپ کا ترکہ بھی سب تمام ہو گیا تھا۔ شادی کے دن وہ اپنے پیپا کو یاد کر کے بہت روئی تھی۔ اگر وہ ہوتے تو اس کی ذہانت

اور اس کی تعلیم پر کتنا خوش ہوتے، اس پر فخر کرتے آج اس کی شادی کے دن اسے دلہن کے روپ میں دیکھ کر وہ کبھی مسکراتے اور کبھی اس کی جدائی پر روتے بہاتے۔

وہ رخصت ہو کر حمیرا رضا کے ساتھ اس نے گھر میں آگئی۔ حمیرا کے بھائی، بھابھی، ان کے بچے اور ان کے چند قریبی دوست رخصتی کے بعد اس کے اپارٹمنٹ میں ان دونوں کے ساتھ موجود تھے۔ وہ کچھ دیر ان دونوں کے ساتھ رہے تھے۔ پھر ایک کمرے کے وہ سب جانے کے لیے اٹھنے لگے۔ پہلے ان کے دوست رخصت ہوئے اور پھر رات دو بجے حمیرا بھابھی اور ان کے پانچوں بچے بھی جانے کے لیے گئے۔ حمیرا نے رسماً ”جی جواد بھائی اور ان کی رات یہیں رکنے کی دعوت نہیں دی۔ وہ سرحد کی خاموش بیٹھی تھی، پھر بھی اسے حمیرا کے غیر جذباتی پُر تکلف اور رسمی انداز گفتگو پر حیرت ہوئی۔ اتنے کی اعصاب شکن صورت حال، خوف، اندیشہ ان سب سے نڈھال ہو چکی تھی اور اب جب بیڈ روم میں اکیلی بیٹھی تھی تو اسے ایسا لگا کہ اب اسے اور اندیشے پالنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس نے پرسکون اور مطمئن کرنے کی کوششیں کرنے لگیں۔ حمیرا چند لمحوں ہی میں جواد بھائی اور ان کو خدا حافظ کہہ آیا تھا۔

آج سب لوگوں نے اس کی بہت تعریفیں کی۔ کلثوم اور صنم نے خاص طور پر دلہن بننے کے روپ کو دل کھول کر سراہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسی غیر معمولی کشش اور جاذبیت تھی جو ڈالنے والے کسی بھی شخص کو دوسری نظر سے دیکھنے پر مجبور کیا کرتی تھی۔ صنم کو یقین تھا کہ آج اس کی حسن کی شان میں ایک آدھ غزل نہیں پڑے گی کہہ ڈالے گا۔ اور حمیرا نے نہ غزل کہی تھی اس نے اس کی تعریف بے شک بہت کی تھی۔ کہا تھا کہ وہ یونیورسٹی میں جیسی خوبصورت تھی آج اس سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت

تھی کہ وہ اس کے ممکنہ ردِ عمل کو تصور کی آنکھ سے دیکھ کر انجوائے کر رہا ہے۔ جو وہ کرتی اسے سوچ کر اب اس وقت اس جگہ بیٹھ کر اسے خود بھی ہنسی آنے لگی تھی جسے اس نے بمشکل کنٹرول کیا تھا۔ ”اگلے روز مجھے انسٹی ٹیوٹ میں دیکھ کر جو تاثرات تمہارے چہرے پر آئے تھے انہیں دیکھ کر مجھے واقعی ایسا لگا تھا جیسے میں کوئی سڑک چھاپ لفتنگا ہوں جو خوا مخواہ ایک شریف لڑکی کو تنگ کیے چلا جا رہا ہے۔ ویسے اس روز میں کسی سیمینار میں نہیں صرف تمہاری خیریت ہی پوچھنے آیا تھا۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا اور اس بار وہ اپنی مسکراہٹ اس سے چھپا نہیں پائی تھی۔

ایک انجانے سے خوف کی جس مسلسل کیفیت میں وہ گھری تھی دھیرے دھیرے اس سے نجات پانے لگی تھی۔

اگلے روز ان کا ویدیمہ ہوا تھا۔ ویلیمے کی تقریب میں گو کہ مہمانوں کی تعداد بہت کم تھی مگر وہ تقریب بھی بہت شاندار۔ جواد بھائی اور ان کی فیملی کے سوا حمیر کے خاندان کا کوئی فرد اس تقریب میں موجود نہیں تھا۔ مہمانوں میں سب اس کے کولیگز اس کے قریبی دوست اور دیگر ملنے ملانے والے شامل تھے۔ اسے یہ بات بہت عجیب لگی۔ مگر صرف ایک دن میں وہ حمیر سے اتنی بے تکلف نہیں ہوئی تھی کہ اس بارے میں کچھ پوچھ پائی۔

اگلی صبح اس کی آنکھ کھلی تو حمیر اسے ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑا ٹائی باندھتا نظر آیا۔ وہ چونک جانے والے انداز میں یک دم اٹھ بیٹھی۔ اپنی شادی کے تیسرے دن وہ صبح صبح اتنے اہتمام سے تیار ہو کر کہاں جا رہا تھا؟

”آپ کہیں جا رہے ہیں؟“

”تم یہ آپ آپ کر کے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دو۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میری بیوی نہیں بلکہ میری کوئی کولیگ مجھ سے مخاطب ہے۔“ اسے اٹھ کر بیٹھا دیکھ کر وہ فوراً ”ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے ہٹا اور پھر اس کے پاس آتے ہوئے اس طرزِ مخاطب پر اپنے

خف کر رہی ہے۔ مگر اس کی ماہ سے شادی کی وجہ اس کی خوبصورتی سے زیادہ اس کی ذہانت تھی۔ وہ اس کی ذہانت سے متاثر ہوا تھا۔ اسے اس کے بات کرنے کا انداز اچھا لگا تھا۔

”میں کبھی کسی ایسی لڑکی سے متاثر نہیں ہو سکتا تھا جس کے پاس حسن تو ہو پر ذہانت نہ ہو۔ ہر نارمل انسان کی طرح خوب صورتی مجھے بھی متاثر کرتی ہے مگر صرف اسے بنیاد بنا کر میں کسی لڑکی کو شادی کے لیے پسند نہیں کر سکتا تھا۔ میری خوش قسمتی کہ اللہ نے پہلے حمیر سے نصیب میں دونوں ایک ساتھ لکھ دی تھیں۔ مجھے ایسی لڑکی مل گئی جو بے تحاشا خوب صورت بھی ہے اور بے انتہا ذہین بھی۔“ اس کی انگلی میں ڈائمنڈ کی فیملی کو تنگ پہناتے ہوئے حمیر نے کہا تھا۔

”جب تم ڈاکٹر اعجاز کے آفس میں آئیں تو میں نے تمیں ذرا بھی اہمیت نہیں دی تھی۔ میں ان سے جو اتنے دنوں تک کرنے گیا تھا وہ کر چکا تھا اور جب تم آئیں تو وہاں ریشے ڈریس سے اٹھنا ہی چاہ رہا تھا۔ مگر پھر یوں ہوا کہ میں وہاں سے جب وہ اس اٹھ نہیں پایا۔ تم نے محض پانچ منٹ میں ہی مجھے اپنی بابت ڈرنے کی سب اس طرح متوجہ کر لیا کہ میں وہاں بیٹھا رہنے کے لیے خود کو سزا دے کر نہیں پایا۔

”میں شریوں تمہارے بولنے کا خوب صورت انداز۔ ایک تو ان کی فیملی کی اتنی پیاری اوپر سے لہجہ ایسا دلنشین۔ مجھے کبھی کسی لڑکی نے اس طرح متاثر نہیں کیا تھا۔ میں وہیں کی تھیں مجھے مجھے تم سے شادی کا فیصلہ کر چکا تھا۔ تب ہی تم اس کے اس اتنی نوعیت کے وہ سوالات پوچھے تھے جنہیں سننے میں تمہارے چہرے پر ناگواری پھیل گئی تھی اور پھر اسی اس پر مجھے تمہاری کے ساتھ تم گفتگو ادھوری چھوڑ کر جب ایک گھنٹے ڈالنے پر مجھے وہاں سے اٹھیں تو میرا دل چاہا تھا میں تمہارا ہاتھ حمیر اس کے ہاتھ پر نہیں روک لوں۔“ ماہا تم کہیں مت جاؤ۔ بس پورا دیوانہ ہے جسے اس بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرتی رہو۔ میں نے یہ دیوانہ جس دیتے رہنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں سنتے رہنا چاہتا تھا۔ اس وقت اگر میں واقعی ایسا کر جاتا تو تم میرے ساتھ گئی ہو۔“ اس نے کہا سلوک کرتیں؟“ مبسم نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ لہجے کی شرارت یہ بتا رہی

”وہاں پر بھی کوئی میٹنگز ہیں کیا؟“ نہ جانتے ہو۔
بھی اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا اور وہ بے ساختہ قہقہہ لگا
ہنس پڑا تھا۔

”ہاں، ایک لڑکی ہے ماہا حمیر رضا اس کے ساتھ
اگلے دس دنوں تک، چوبیس گھنٹے میری میٹنگز رہیں گی۔
ان تمام جگہوں پر۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے
قریب بٹھاتے ہوئے بولا۔



”میں نے اپنی زندگی کے اگلے سات آٹھ سالوں
تک کی جو منصوبہ بندی کر رکھی تھی اس میں شادی
کی کسی چیز کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اگلے آٹھ سالوں تک
میرا شادی کرنے کا سرے سے کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔
مگر آٹھ سالوں بعد جب میں شادی کرنے کا سوچتا تھا
ماہا احمد علی مجھے مل بھی پاتی، اس کی کیا گارنٹی تھی
لڑکی مجھے دیکھتے ہی آنکھیں ماتھے پر چڑھالے، تیور
پر بل ڈال لے۔ کیا اس سے میں یہ کہہ سکتا تھا کہ۔
”سنو ماہا! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر
نہیں، آٹھ سال بعد۔ کیا تم آٹھ سالوں تک میرا
کر سکتی ہو؟“ سوات میں اس کے ساتھ گھومتے ہوئے

حمیر اس سے باتیں کر رہا تھا۔ ”میں تم ہی سے
کرنا چاہتا تھا۔ مگر ابھی نہیں، سات آٹھ سال بعد۔
میرے کیہ پیر کی شروعات ہے میں اس وقت شادی
سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا، مگر ڈر مجھے یہ لگا کہ جب
شادی کرنے کی پوزیشن میں آجاؤں گا تب
نجانے کہاں کھو چکی ہوگی۔ مجھے تمہیں کھو دینے
لاحق تھا اور اس ڈر نے میری ساری پلاننگز کا
کر کے مجھ سے قبل از وقت شادی کا فیصلہ کر دیا۔
”مجھے ان پلاننگز کے ناکام ہو جانے پر خوشی
کرنا چاہیے یا افسردگی کا؟“

”تمہاری مرضی ہے۔ ویسے تم اس بات پر
تو فخر بھی محسوس کر سکتی ہو کہ ایک ایسا شخص
میں شادی سے ہٹ کر ابھی اور بہت سے کاموں سے
تھا، تم نے اس سے باقی سب کاموں سے پائے

اعتراض کا برملا اظہار کیا۔

”ویسے میں بینک جا رہا ہوں۔ یعنی اپنے آفس۔“
”آفس؟“ اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی
رہ گئی تھیں۔

”نہیں جاؤں؟“ وہ مسکراتے ہوئے اس کے
قریب بیٹھ گیا۔

”نہیں، میں نے ایسا تو نہیں کہا۔“ وہ اسے اتنا
قریب بیٹھتے دیکھ کر تھوڑا دور ہٹی۔ وہ اگر قریبی دوستوں
کے سوا دوسرے لوگوں سے پر تکلف طریقے سے اور
فاصلے رکھ کر ملا کرتی تھی تو یہاں گڑبڑ یہ تھی کہ حمیر رضا
”لوگ“ نہیں اس کا شوہر تھا اور وہ اس کے پر تکلف
انداز کو اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا، اسی لیے جیسے ہی وہ
دور ہٹی اس نے اسے ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے دوبارہ
اپنے اتنا ہی قریب کر لیا جتنی وہ پہلے تھی۔

”خاتون! اب آپ مس ماہا احمد علی نہیں کہ مجھ
سے ایک کرسی چھوڑ کر بیٹھیں اور میں دیکھتا رہوں،
اب آپ مسز ماہا حمیر رضا بن چکی ہیں اور یہ بات آپ کو
یاد رہنا چاہیے۔“



وہ دن اور اس سے اگلا دن بھی اسی طرح گزر گیا
تھا۔ وہ صبح تیار ہو کر آفس چلا جاتا اور پھر شام ساڑھے
چھ اور سات کے درمیان اس کی واپسی ہوتی اور دن بھر
میں صرف ایک بار اس نے ماہا کو فون کیا، تیسرے دن وہ
اسے اپنے ساتھ لے کر اسلام آباد آگیا۔ یہاں اسے
کوئی میٹنگ انینڈ کرنی تھی اور غالباً ”کسی ورک شاپ
یا سیمینار میں بھی شرکت کرنی تھی۔ یہ ہنی مون کی کون
سی قسم تھی وہ جانتی نہیں تھی۔ پورے تین دن وہ
ہوٹل میں سارا سارا دن اکیلے رہ کر اپنا ہنی مون مناتی
رہی۔ اور چوتھے دن جب اسے لگا کہ اب وہ اس
بندے کی ان نہ سمجھ میں آنے والی باتوں کو مزید
برداشت نہیں کر سکتی، تب وہ صبح سویرے اس سے
سامان پیک کرنے کا کہنے لگا۔

”ہم ایبٹ آباد، سوات اور گلگت جا رہے ہیں۔“

اگر محبت کا اظہار لفظوں سے کرنا ضروری ہوتا ہے تو میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں ماہا! تم میری زندگی کا سب سے خوبصورت احساس ہو۔“ اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے اس نے محبت اور چاہت سے بھرپور لہجے میں کہا تھا۔



وہ گلگت میں تھے اور سخت ترین سردی میں وہ اپنے کمرے میں بیٹر آن کیے کمرے میں گھس کر بیٹھے ہوئے ڈرائی فروٹس کھانے اور باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ آج وہ قدرے سنجیدہ موضوعات پر اس سے باتیں کر رہا تھا۔

”تمہیں میرے ساتھ بہت تیز رفتار اور بہت بھاگتی ہوئی زندگی گزارنی پڑے گی۔ میں زندگی کو جیسی ہے اور جہاں ہے کی بنیاد پر نہیں گزار سکتا۔ میں ابھی زندگی میں بہت کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ میرے کیریئر کی ابتدا ہے ابھی مجھے بہت آگے جانا ہے۔ کیا تم میری رفتار کا ساتھ دے سکو گی؟“ اس نے ایک لمحہ کی بھی دیر لگائے بغیر سر اثبات میں ہلادیا تھا۔ کیسی عجیب سی بات تھی جس شخص کے سنگ زندگی کا نیا سفر شروع کرتے ہوئے وہ بے شمار اندیشوں اور وسوسوں کا شکار تھی اب اس کی محبت میں مبتلا ہو کر اپنے ان اندیشوں اور وسوسوں پر غور نہیں رہی تھی۔ اسی رات حمیر نے اسے اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کے متعلق بھی سب کچھ بہت سچائی اور ایمانداری سے بتایا تھا۔ اپنے خاندانی پس منظر اور اپنے بچپن کی کوئی بات اس نے ماہا سے نہیں چھپائی تھی۔ اسے حمیر کی صاف گوئی اور سچائی نے بے انتہا متاثر کیا تھا۔

اس جیسے مہذب بندے کے بارے میں کوئی سوچ بھی سکتا تھا کہ وہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جہاں اعلیٰ تعلیم تو کیا عام سی تعلیم حاصل کرنے کا بھی رواج نہیں تھا۔ اس کی والدہ لکھنا پڑھنا کچھ نہیں جانتی تھیں اور والد بھی بس واجبی ہی سے تعلیم یافتہ تھے۔ اس کے والد کسی مل میں ایک معمولی سے ملازم

فیصلہ کروالیا اور وہ بھی بالکل آنا ”فانا“۔“ اس کے شوخی بھرے سوال کے جواب میں وہ مصنوعی سنجیدگی سے مسکراہٹ لبوں پر روکتے ہوئے بولا۔

”پتا نہیں بات فخر کرنے والی ہے بھی یا نہیں۔ دنیا میں ایک میں اکیلی ذہن لڑکی تو نہیں۔ اگر کسی دن کوئی مجھ سے زیادہ ذہین لڑکی مل گئی تو میں اور میرا فخر تو منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔“ اپنی شادی شدہ زندگی کے ان چند دنوں میں ان کے درمیان بہت سے موضوعات پر بہت ساری باتیں ہوئی تھیں، مگر وہ ایک لفظ جو اس کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا ایک بار بھی درمیان میں نہیں آیا تھا۔ وہ خوب صورتی سے متاثر نہیں ہوا تھا تو ذہانت سے ہو گیا تھا اور محبت؟ یہ ایک لفظ وہ بڑی شدت سے اس کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔ اور وہ اس کے جواب میں چھپے مفہوم کو سمجھ بھی گیا تھا تب ہی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا۔ ”کیا یہ کہنا بہت ضروری ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں؟“

”ہاں۔ ورنہ مجھے کیسے پتا چلے گا کہ جس بندے کو میں آفس، آفس اور کام، کام اور کام میں مصروف دیکھ رہی ہوں اس کی زندگی میں میری کیا اہمیت ہے؟“ ابتداً جس جھجک اور تکلف کو وہ محسوس کرتی رہی تھی اب آہستہ آہستہ اس کے حصار سے بھٹی جا رہی تھی۔ اس کی وہ تنہائی جسے وہ بچپن سے سنی آئی تھی یک دم ہی کہیں غائب ہو گئی تھی۔ اس کی تھکنیں بانٹنے ہر وقت کوئی اس کے ساتھ تھا اور اس کے لیے یہ بڑا انوکھا اور دلفریب احساس تھا کہ جو شخص اس کے ساتھ ہے وہ اس پر بلا شرکت غیرے پورا حق رکھتا ہے۔ اور حق رکھنے والا یہ احساس از خود ہی اس کے اندر پیدا ہوتا چلا جا رہا تھا۔

اپنی زندگی کے اتنے برسوں تک رشتوں اور محبتوں کے محرومیاں سہتی رہنے والی لڑکی کو اچانک ہی ایسا لگنے لگا جیسے اسے سب سے زیادہ اپنا کہہ سکنے والا ایک رشتہ اور پورا حق رکھنے والی ایک بھرپور محبت مل گئی ہے۔ اور زندگی سے کیا چاہا تھا ماہا احمد علی نے؟ میری زندگی میں تمہاری بہت اہمیت ہے ماہا! اور

البحسن ہوتی تھی۔ نہ ان میں آگے بڑھنے کی جستجو تھی اور نہ ترقی کرنے کی لگن۔ تعلیم چلو اگر انسان زیادہ حاصل نہ بھی کر پایا ہو تب بھی اپنے لیے محنت اور کوشش کے ذریعے ترقی کی راہیں کھول سکتا ہے۔ مگر وہ تو کنویں کے مینڈک کی طرح اپنے حال میں مگن بڑے خوش تھے۔ بڑا تیر مارا تھا انہوں نے تو کپڑے کی مل کی نوکری چھوڑ کر اپنی بیوی کے بھائیوں کے ساتھ شراکت داری کر کے کپڑے کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ لیاقت آباد میں کرایہ کی دکان اور شراکت داری والا محدود سا کاروبار۔ وہ انہیں ایک ناکام انسان کہتا تھا۔ محدود آمدنی، محدود وسائل، پانچ بچوں کے اخراجات، نہ کوئی اسٹیشن نہ کوئی اسٹینڈرڈ، جواد بھائی کے گھر کو چھوڑنے کے بعد وہ اندرون سندھ سے آئے اپنے پانچ دوستوں کے ساتھ ایک کمرے کے فلیٹ میں رہا کرتا تھا۔

اس نے کوئی آسان زندگی نہیں گزاری تھی۔ وہ محنت کر کے، سختیاں جھیل کر اور کڑی مشکلات سے گزر کر اس مقام تک پہنچا تھا۔ لیکن یہ مقام اس کی نگاہوں میں کافی نہیں تھا۔ ابھی اسے آگے جانا تھا، بہت آگے۔ اسے ترقی کرنی تھی، بہت ترقی۔ ابھی جو کچھ اس نے حاصل کیا تھا وہ تو اس کی نگاہوں میں آغاز تھا۔ ترقی اور کامیابی کی شاہراہ پر اس کا پہلا قدم آگے ایک لمبا اور دشوار سفر تھا۔ وہ زندگی میں ناکام نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ اپنے پروفیشن میں کامیابی کی آخری حدود تک پہنچنا چاہتا تھا۔ ایک ملکی و بین الاقوامی سطح پر کامیاب سمجھا جانے والا قابل اور ماہر بینکر۔ ڈیفنس کے جس فیز میں وہ دو کمروں کے کرایہ کے اپارٹمنٹ میں رہتا تھا، وہ وہاں نہیں بلکہ ڈیفنس کے سب سے اونچی بی فیز میں اپنے ذاتی دو تین ہزار گز کے بنگلے میں رہنا چاہتا تھا۔ جو گاڑی وہ ڈرائیو کرتا تھا، وہ دوسروں کو شاہی اچھی لگتی ہو مگر اس کے معیار کے حساب سے وہ اچھی نہیں، بس صرف گزارے لائق تھی۔ وہ معمولی چیزوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لینے والا انسان نہیں تھا۔ اسے حیرت انگیز ترقی اور کامیابی کی انتہائی منزلوں کو چھو لینے

تھے۔ اس نے اپنے چھوٹے سے گھر میں غربت اور کمپرسی والے حالات دیکھے تھے۔ ایسے حالات کے جہاں سفید پوشی کا بھرم رکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ جواد بھائی اس سے سولہ سال بڑے تھے اور صرف اپنے دو بچوں کا خرچ اٹھانا ہی اس کے والد کے لیے اپنی محدود آمدنی کے سبب سخت دشوار تھا۔ انہوں نے اسے ایک سرکاری اسکول میں داخل کروایا تھا مگر سرکاری اسکول میں اسے تعلیم دلانا بھی ان کی استطاعت سے باہر ہوا کرتا تھا۔ اس نے اپنی والدہ کو اپنے بچپن ہی سے بیمار دیکھا تھا۔ مگر ان ماحول اور ان حالات میں وہ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر وظیفے حاصل کرتے رہنے کے سبب اپنی تعلیم کا سلسلہ کامیابی کے ساتھ جاری رکھتا رہا۔ وہ اس ماحول میں اتنا مختلف کیسے پیدا ہو گیا تھا، یہ تعجب کی بات تھی، مگر سچ یہی تھا کہ وہ گدڑی کا نعل تھا۔ اس کی قدرتی ذہانت اور قابلیت اسے اپنے ماحول سے الگ کرتی تھی۔ وہ دس سال کا تھا تو اس کی والدہ اور بارہ سال کا تھا والد کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ اسے میرٹ اسکول ٹیچس ملتی رہیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ اپنی خصوصیات پرستی کرنے کے لیے اس نے پارٹ ٹائم چھٹی سیل میں بی۔ اے کی تعلیم کی تھی، نیوشنز پرنٹنگ مل تھی۔ اس کے پاس قدرتی ذہانت تو بھی باقی مدد اس نے اپنی آپ کی تھی۔ وہ مکمل سیلف میڈ تھا۔

اب جس لب و لہجے میں وہ روایتی سے انگریزی بولتا تھا اسے سن کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کسی گورنمنٹ اسکول کا پڑھا ہوا ہے۔ اس کے مینورز اس کے ایٹی کیٹس، اس کی گفتگو، اس کا اٹھنا بیٹھنا، ان سب کو اس نے خود محنت کر کے سنوارا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ”جس انسان کے پاس کچھ کر گزرنے کا عزم ہو، ذہانت ہو، قابلیت ہو، خود پر اعتماد ہو تو پھر اسے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔“ وہ صرف اثر کرنے تک جواد بھائی اور ان کی فیملی کے ساتھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنا راستہ ان سے الگ کر لیا تھا۔ اسے ان کے زندگی گزارنے کے طریقہ، محدود سوچ اور گھٹے ہوئے ماحول والے گھر سے

باب اس لیے اچھا لگا کہ اس کے حصول کے لیے وہ محنت کرنے کی بات کر رہا تھا، کسی غلط راستے پر چلنے کی جس۔ اس کے سب خواب اس نے اپنی پلکوں پر سجا دیے تھے۔ جب اس شخص کو دل و جان سے اپنا لیا تھا تو اس کے خوابوں کو کیوں نہ اپنائی۔

وہ ماہا کی محبت میں مبتلا ہو کر اپنی سوچوں کے خلاف جلدی شادی کرنے پر تو مجبور ہو گیا تھا لیکن ابھی چند سالوں تک وہ اپنی فیملی میں اضافہ نہیں چاہتا تھا اور یہ بات اس نے ماہا سے اسی رات ہی کافی سنجیدگی سے کہی تھی۔

”بچوں کی ذمہ داری بہت بڑی ہوتی ہے ماہا! ماں باپ کا کام صرف انہیں پیدا کرنا نہیں بلکہ انہیں بہترین رہائش، بہترین آسائشیں اور بہترین تعلیم دینا بھی ہوتا ہے۔ میں اپنے بچوں کو ویسا بچپن اور ویسی تعلیم نہیں دینا چاہتا جیسی میرے ابا جی نے مجھے دی۔ ہم اپنے بچوں کو ایک بہترین زندگی دیں گے ماہا! مگر اس کے لیے ہمیں چند سال انتظار کرنا ہو گا۔“ اس نے حمیرا کی یہ بات بغیر کسی اختلاف کے فوراً ”مان لی تھی۔ محبت کی ایسی مضبوط ڈور اس شخص کے ساتھ بندھی تھی کہ اسے لگتا وہ اس کی کوئی بات بھی رد کر ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ ایک شخص، وہ ایک رشتہ، وہ ایک محبت، اس کی زندگی اب اس محور سے کبھی ہٹ نہیں سکتی تھی۔

وہ دس دن ان دونوں نے ساتھ یوں گزارے جیسے ہمیشہ دنیا میں ایک دوسرے کے سوا کسی بھی شخص اور چیز سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ وہ اس کے ساتھ محبت گھومی، بہت انجوائے کیا اور وہ ہر بل اپنے رویوں سے اسے اپنی محبت کا بھرپور انداز میں احساس دلاتا رہا۔



بنی مومن سے لوٹے تو زندگی صرف گھومنے پھرنے کی بجائے کرنے والے دور سے نکل کر اپنے معمول بن گئی۔ ان کی شادی سے مہینہ بھر پہلے ہی حمیرا اس

نئے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوا تھا، اس لیے ابھی اپارٹمنٹ پوری طرح فرنشڈ اور ڈیکورڈ نہیں تھا۔ وہ حمیرا سے وہاں کا کرایہ سن کر بے ہوش ہوتے ہوتے نکلی۔ اگر وہ اتنے دنوں میں اس کے مزاج کو سمجھ نہ گئی ہوتی تو یہ ضرور کہتی کہ یہاں کے بجائے وہ کسی سے اپارٹمنٹ میں نہیں رہ سکتے؟

وہ جیمز میں جو فرنیچر لائی تھی، وہ اس جگہ کے شایان شان نہیں اور نہ ہی حمیرا کے معیار کے مطابق ہے، یہ بات وہ خود بہت اچھی طرح سمجھتی تھی۔ حمیرا نے اس کی اجازت سے وہ سارا فرنیچر فروخت کر کے نیا قیمتی اور خوب صورت فرنیچر خرید لیا تھا۔ نیا فرنیچر خریدنے میں سارے پیسے تو حمیرا ہی کے خرچ ہوئے تھے۔ حمیرا کے ساتھ ساتھ وہ بھی اس نئے فرنیچر کے وہاں سج جانے پر بہت خوش تھی۔ اپنے گھر کی پہلی پہلی سجاوٹ اسے خوشی کے ساتھ فخر میں بھی مبتلا کر گئی تھی۔ ماہا احمد علی کو پورے حق کے ساتھ اپنا کہہ سکنے والا ایک گھر آ کر کار مل ہی گیا تھا۔



جس طرح حمیرا نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بالکل سچائی سے بتایا تھا، اسی طرح اس نے بھی اسے پوری سچائی سے اپنے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ سب جو کبھی کسی سے شہر نہیں کر پائی تھی۔ دوستوں کے سامنے بھرم قائم رکھنے کو وہ مہی کی محبت، منظر انکل کا التفات اور بھائی بہن کی چاہت کے جھوٹے قصے گھڑا کرتی تھی، مگر اس شخص کے سامنے اسے جھوٹی عزت اور جھوٹا بھرم قائم رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ساری دنیا میں اس کا سب سے زیادہ اپنا تھا۔ وہ کسی بھی طرح کی شرمندگی محسوس کیے بغیر اس سے اپنا ہر دک کہہ سکتی تھی۔

”تمہیں ایسی بیوی ملی ہے جو کبھی میکے جایا ہی نہیں کرے گی۔ شوہروں کو بڑی آزادی کا احساس ہوتا ہے نا، جب بیویاں میکے جاتی ہیں۔ تمہیں یہ احساس کبھی نہیں مل سکے گا۔“ اس کے کندھے پر سر رکھ کر اس

نے آنسو بہائے تھے، اپنے سارے دکھ اس سے کہے تھے اور اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو خشک کیے تھے۔ رورو کر جب وہ اپنا دل ہلکا کر چکی تو ماحول کی اویسی دور کرنے کی خاطر قصداً "شرارتی انداز میں یہ بات اس سے کہہ گئی۔

"تم اگر مجھ سے دور جاؤ گی تو مجھے آزادی کا نہیں بلکہ گھٹن کا احساس ہوگا۔ اچھا ہے کہ تم اپنی ممی کے گھر نہیں جایا کرو گی، ورنہ اور کسی بات پر ہمارا جھگڑا ہوتا یا نہیں، تمہارے وہاں جانے پر ضرور ہوا کرتا۔ میں تمہیں خود سے دور اب کبھی دیکھ ہی نہیں سکتا۔" وہ اسے اپنی محبتوں کا یقین دلا رہا تھا اور وہ سرشار سی ہوتی اس کے بازو پر سر رکھ کر سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔



انہیں اپنی روٹین لائف پر آئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے، جب ماہا کارزلٹ آگیا۔ اپنی توقع کے عین مطابق وہ بڑے شاندار اور نمایاں انداز میں کامیاب ہوئی تھی۔ حمیر نے اس کی کامیابی کو بڑے جوش و خروش سے سلیپیوٹ کیا تھا۔ وہ بے تحاشا خوش تھا بلکہ اسے تو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس سے بھی زیادہ خوش ہے۔ اپنی تمام مصروفیات چھوڑ چھاڑ اس نے وہ ساری شام ماہا کے نام کردی تھی۔ ساری شام وہ دونوں ساتھ رہے تھے پھر رات میں حمیر نے اسے فائیو اسٹار ہوٹل میں شاندار ڈنر کروایا اور گفت میں اسے وائٹ گولڈ کی چین دی جس میں ڈائمنڈز سے سجلا کٹ تھا۔ یہ گفت بے شک بہت قیمتی تھا مگر اس کی اصل قیمت یہ تھی کہ حمیر نے یہ اسے خود اپنے ہاتھوں سے پہنایا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے احساس پایا تھا کہ اپنی خوشیاں وہ کسی کے ساتھ بانٹ بھی سکتی ہے، کوئی اور بھی ہے جو اس کی کامیابیوں اور اس کی خوشیوں کو اپنی کامیابیاں اور اپنی خوشیاں سمجھ کر بے تحاشا خوش ہو سکتا ہے۔

ڈنر کرنے کے بعد وہ دونوں بہت دیر تک سمندر

کے کنارے گھومے تھے۔ اگلے روز چھٹی کا دن تھا، اسی لیے بے فکری سے رات گئے تک جاگ کر انہوں نے ماہا کی پسند کی مووی دیکھی تھی۔ اگلی صبح وہ دونوں بارہ بجے سو کر اٹھے تھے۔ انہوں نے ناشتہ اور لنچ ایک ساتھ مل کر کیا تھا۔ وہ برتن دھونے میں مصروف تھی جب حمیر نے اسے آواز دے کر بلایا۔

"کیا بات ہے حوی؟" اسے حوی کہنا ماہا کو اچھا لگا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جب وہ اسے اس نام سے بلاتی ہے تو دل میں محبت اور قربت کا احساس مزید بڑھ جاتا ہے۔ وہ اپنے سامنے پھیلے انگریزی اخبار پھیلانے بیٹھ تھا۔

"یہ دیکھو، میں نے تمہارے لیے کتنی زبردست چیز تلاش کی ہے۔" وہ فلور کشن پر اس کے برابر میں بیٹھ گئی اور پھر پوری طرح اخبار پر جھک کر اس اشتہار کو دیکھنے لگی جس پر حمیر نے انگلی رکھی ہوئی تھی۔ ایک ملٹی نیشنل کمپنی کو فریش MBAs کی ضرورت تھی۔ اس اشتہار کے علاوہ حمیر نے تین اور اشتہارات پر بھی نشان لگا رکھا تھا جن میں ایک اشتہار لوکل کمرشل بینک کا بھی تھا مگر وہ زیادہ اکیسائیڈ اس پہلے والے اشتہار ہی کے بارے میں تھا۔ "تم یہاں اپلائی کرو ماہا! اگر تمہیں یہاں جاب ملے گی تو مزا آجائے گا۔ اتنے شاندار کیریئر والی جاب اتنا بہترین سیلری پیکج۔" وہ اس کی ایکسائٹمنٹ سے ہلے سے مسکرائی۔

"حوی! جاب تو بہت اچھی ہے لیکن نائن ٹو ٹو والی جاب کیا اب میں کہاؤں گی؟ میں اپنے گھر کو تمہیں انکور نہیں کرنا چاہتی۔ صبح تم آفس جاؤ تو تمہیں دروازے تک جا کر بڑے اہتمام سے رخصت کروں اور جب شام میں واپس آؤ تو تمہارے بہت اچھا سا کھانا پکا کر رکھوں اور خوب اچھی طرح ہو کر سچ سنور کر تمہارا دروازے ہی پر انتظار کروں۔"

"تو کیا ماہا احمد علی نے MBA کرنے کی مشق

بولی۔ ”ویسے ہم اس طرح بات نہیں کر رہے جیسے
جواب مجھے آفر ہو چکی ہے۔ بس اب اسے قبول کرنے یا
نہ کرنے کا فیصلہ مجھے کرنا ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ
میں ٹیسٹ میں ہی فیل ہو جاؤں یا وہ انٹرویو ہی میں مجھے
رہنچھٹ کر دیں اور انڈوں کی ٹوکری ہمارے سر پر
سے گر جائے۔“

”ناممکن ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔“ اس کے شرارتی
انداز کے جواب میں وہ نفی میں سر ہلاتا سنجیدگی اور بہت
یقین کے ساتھ بولا۔ ”حمیر رضا کبھی کسی جگہ فیل نہیں
ہوا تو اس کی بیوی کیسے ہو سکتی ہے؟“



حمیر نے اس سے جہاں جہاں کہا تھا اس نے ان
تمام جگہوں پر اپلائی کر دیا تھا۔ اس کے پاس انٹرویو کے
لیے کالز آنا بھی شروع ہو گئی تھیں۔ حمیر کو زیادہ شدت
سے اس کمپنی سے کال کا انتظار تھا پھر آخر کار وہاں سے
بھی اس کے پاس کال آگئی۔ تب تک وہ تین جگہوں پر
انٹرویوز دے کر آچکی تھی اور ان میں سے ایک جگہ
سے تو اسے جاب مل جانے کی نوید بھی مل چکی تھی حمیر
ٹیسٹ اور انٹرویو کی تیاری کے سلسلے میں اس سے کہیں
زیادہ سنجیدہ تھا۔ اس نے خود ساتھ بیٹھ بیٹھ کر اسے ان
دونوں چیزوں کی تیاری کروائی تھی۔

”حموی! میں بور ہو گئی ہوں تمہارے منہ سے یہ
خشک باتیں سن سن کر۔ کتنے دنوں سے تم نے نہ مجھے یہ
بتایا کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو اور نہ یہ کہ میری
براؤن آنکھوں کی طرف دیکھنے کے بعد تم باقی ہر بات
بھول جاتے ہو۔“ ڈھیر ساری کتابیں سامنے سے ہٹا کر
ناز بھرے انداز میں اس کے کندھے پر سر رکھ کر بولی۔
”تم زیادہ سیریس نہیں لگ رہی ہو مجھے بس اس
لیے ڈر رہا ہوں کہ کہیں تم وہاں کچھ گڑبڑ نہ کر آؤ۔“
اس نے اس کی غیر سنجیدگی اور غیر دلچسپی پر اسے
سرزنش کی۔

”اچھا اب تم سنجیدہ ہو جاؤ اور دور ہٹ کر بیٹھو۔“
ماہا اس کے کندھے سے سر ہٹا کر فوراً سنجیدہ ہو کر بیٹھ

اس لیے اٹھائی تھی کہ وہ شادی کے بعد آج آلو گوشت
پکھن یا گو بھی گوشت جیسی سوچوں میں اپنا وقت گزارا
کریں گی؟ اگر یہی کرنا تھا تو لی اے بلکہ انٹر بھی
تیارے لیے کافی رہتا۔ ”وہ دادا آیا والے اس کے خفگی
سے بھرپور لہجے پر کھل کر مسکراتی تھی۔

”میں آلو گوشت اور گو بھی گوشت کے علاوہ
سرے سالن پکانے کے متعلق بھی سوچا کروں گی،
عزمت کرو۔“ پھر اسے سینہ ہی نگاہوں سے گھورتا
پاکوہ بھی قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

”میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں گھر میں بیٹھی
رہوں گی۔ میرا مطلب تھا میں کوئی ہلکی پھلکی سی
جیب کر لوں، ٹائم پاس کرنے والی۔ مجھے کسی کیریئر
Oriented جاب کی طرف جاکر اور کسی سنجیدہ
محنت طلب کیریئر کو اپنا کر اپنے گھر کو بالکل انکوری نہیں
کرنا۔ کیا میری یہ سوچ غلط ہے؟“

”صرف غلط نہیں بلکہ ایک دم بکواس ہے۔ اتنی
بڑی ڈگری حاصل کر کے چھوٹی مولی جاب کرو گی؟ اتنی
محنت کی ہے اتنا پڑھا ہے تو اس کا کچھ ریٹرن بھی تو
انسان کو حاصل کرنا چاہیے۔ آئی بی اے سے ایم بی
اے کی ہوئی لڑکی وہ بھی اتنے شاندار گریڈز کے ساتھ
کیا کوئی معمولی سی چند ہزار روپوں والی جاب کرتی اچھی
لگے گی؟ انسان کو اپنے کیریئر کے اشارت میں خوب
سوچ سمجھ کر صحیح راستے پر قدم رکھنا چاہئیں۔ جہاں
میں کہہ رہا ہوں وہاں جاب کرنے سے تمہارا کیریئر
بنے گا حتمی لڑکی!

تمہاری جیسی ٹیلنٹڈ لڑکی جاب اور گھر سب کچھ
ساتھ ساتھ لے کر چل سکتی ہے پھر ہم گھر میں افراد ہی
کتے ہیں؟ صرف دو۔ ہمارے گھر کا ایسا کوئی کام نہیں
جس پر تمہارے صبح سے شام تک گھر میں موجود نہ
ہونے سے کوئی فرق پڑے گا۔ اگر تمہارا کیریئر صحیح
ریک پر چل پڑا تو چند سالوں میں تم کہاں سے کہاں پہنچ
جائی گی۔“

”اچھا بابا، تم جیتے میں ہاری۔“ وہ اس کے مضبوط
نک سے بھری لمبی تقریر کے جواب میں مسکرا کر

کرتی کہ ان کے بچوں کا کمرہ کس طرح کا ہوگا؟ ان کے درمیان بچوں کے موضوع پر بہت زیادہ بات نہیں ہوتی تھی۔ ہاں حمیرہ ضرور کہتا تھا کہ وہ دو بچوں سے آگے اپنی فیملی نہیں برہائیں گے۔ وہ ابھی سے اس وقت کو سوچ کر دل میں انوکھی سی خوشی اور سرشاری محسوس کرتی۔ وہ وقت جب وہ ماں بنے گی اس شخص کے بچے کی جسے وہ دل و جان سے چاہتی ہے۔ اپنا آپ کتنا معتبر اور کتنا مکمل لگنے لگے گا اسے اس وقت۔ وہ اس آنے والے وقت کا بہت صبر سے انتظار کر رہی تھی۔



اسے حمیرہ کی ہر بات اچھی لگتی تھی۔ بس جواد بھائی کے ساتھ اس کا رویہ اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس موضوع پر کئی بار ان میں تکرار ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ جواد بھائی حمیرہ سے واقعی بہت محبت کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اسے ہنی مون سے واپس آنے کے چند روز بعد ہی ہو گیا تھا۔ کتنے پیار سے وہ ان دونوں کو اپنے گھر کھانے کی دعوت دینے آئے تھے اور حمیرہ نے انہیں روکھے انداز میں صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کے انکار پر ان کا چہرہ کیسا بچھ گیا تھا۔ اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ اس انکار میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں تھا پھر بھی وہ شرمندہ ہو گئی تھی۔ وہ ان کے گھر مٹھائی اور پھل بھی لے کر آئے تھے۔ حمیرہ نے ان میں سے کسی چیز کو نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا کہ وہ چیزیں اس کے معیار کی نہیں تھیں۔ ”ہمیں جواد بھائی کے گھر جانا چاہیے تھا حوی! وہ اتنے پیار سے ہمیں انوائٹ کرنے آئے تھے۔“ ان کے جانے کے بعد وہ دل پر بوجھ سا محسوس کرتی حمیرہ سے بولی۔ حمیرہ اس کی بات سنی ان سنی کر کے اس کے ہاتھوں میں پڑی چوڑیوں سے کھیلتا رہا۔

”کون سا ہم دونوں کے کوئی بہت ڈھیر سارے رشتہ دار ہیں۔ ایک جواد بھائی ہی تو ہیں انسان خونی رشتوں سے گٹ کر تو زندگی نہیں گزار سکتا۔“

”فار گاڈ سیک ماہا! پلیز پور مت کرو یا ر! یہ فضول قسم

گئی۔ وہ اسے لیٹ ڈاؤن نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ ماہیہ جاب حاصل کرے تو وہ اسے حاصل کر لینا چاہتی تھی۔

اور پھر اس نے حمیرہ کو لیٹ ڈاؤن کیا بھی نہیں تھا۔ تحریری امتحان اور انٹرویو وہ دونوں مراحل میں سرخرو ہوئی تھی۔ تین مہینوں کا ٹریننگ پیریڈ بہت بھاگتے دوڑتے اور مصروف گزرا تھا۔ اسے اپنے آفس میں ایسی کارکردگی کا مظاہرہ کرنا تھا کہ وہ وہاں مستقل ملازمت کی حقدار قرار پاسکے اور اس مقصد کے حصول کے لیے اسے بے تحاشا محنت کرنی پڑ رہی تھی۔

ماہا کی پوری کی پوری تنخواہ گھر کے اخراجات میں خرچ ہو جاتی تھی۔ وہ ایک مہینے کچھ بچت کر بھی لیتی تو اگلے مہینے گھر کے لیے کسی نئی چیز کے خرید لینے پر وہ بچت خود بخود ہی ٹھکانے لگ جاتی۔

ان دونوں نے زیرو سے اشارت کیا تھا اس سے شادی سے پہلے تک تو حمیرہ دوستوں کے ساتھ اپارٹمنٹ شیئر کر کے رہتا رہا تھا۔ گھر تو ان دونوں کا پہلا یہ تھا۔ چاہے کرایہ کا ہی سہی وہ اپنے گھر کو بنانے، سجانے اور سنوارنے کے لیے ایک ایک کر کے گھر کی ضرورت کی ہر چیز خریدتی رہی۔ اپنی ساری تنخواہ خرچ کر ڈالتی تھی۔ حمیرہ اور وہ الگ الگ تو نہیں تھے۔ اگر اس کی پوری کی پوری تنخواہ گھر کے اخراجات میں خرچ ہو بھی جاتی تھی تو کیا ہوا؟ حمیرہ کی آمدنی جو اس کے مقابلے میں دگنی تھی وہ اس میں سے ہر ماہ کافی رقم بچا لیا کرتا تھا۔ یہ بچت ان دونوں ہی کی تو تھی۔ ان دونوں کے اس گھر کے لیے یہ رقم جمع ہو رہی تھی جو ان کا اپنا ہوگا۔ اپنے ذاتی گھر کا خواب اس کا اور حمیرہ کا مشترکہ خواب تھا۔ اکثر وہ دونوں گھنٹوں بیٹھ کر اپنے گھر کے بارے میں باتیں کیا کرتے۔

”ہم اپنے گھر کے لان کے ایک حصے میں صرف گلاب ہی گلاب لگائیں گے۔ سرخ سفید گلابی بہت سے رنگوں کے گلاب۔“ وہاں کالان کیسا ہو گا والی بات جیسے ہی شروع ہوتی وہ فوراً ”یہ کہا کرتی جب یہ باتیں ہو رہی ہوتیں تب وہ چپکے سے دل میں یہ بھی سوچا

ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لاتے ہوئے متبسم لہجے میں بولی۔
وہ نہ سمجھ میں آنے والی نگاہوں سے اسے دیکھتا، اس
کے ساتھ اندر آگیا اور جیسے ہی ڈانگنگ نیبل پر اس کی
نگاہ پڑی، وہ ٹھٹک کر وہیں رک گیا۔ نیبل کے نیچوں بیچ
رکھا خوبصورت سا کیک اور اس پر لگی دو موم بتیاں جو
نیبل کی آواز سنتے ہی اس نے جلا بھی دی تھیں۔

”ماہا!“ وہ آگے کچھ بھی نہیں بول پایا۔ اس کے
چہرے پر یک دم ہی شرمندگی پھیل گئی تھی۔ شاید اپنا
پچھلے سال کا وہ وعدہ بھی یاد آگیا تھا جو سالگرہ بھول
جانے پر اس نے یہ کہہ کر کیا تھا کہ وہ آئندہ اس دن کو
ہرگز نہیں بھولے گا۔

”بسی اپنی ور سری حوی!“ وہ اس کے گلے میں
بانہیں ڈال کر مسکراتے ہوئے بولی۔
”ماہا! آتم سو سوری۔ میں پھر بھول گیا۔ تم نے مجھے
یاد کیوں نہیں دلایا؟“ وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے
کر بولا۔

”ہاں واقعی یہ تو میری غلطی ہے، مجھے یاد دلانا
چاہیے تھا۔“ شرارتی سے لہجے میں مسکراہٹ دباتے
وہ جیسے بڑی آسانی سے اپنی غلطی مان گئی تھی۔ ”اب
ہم کیک کاٹ لیں؟“ وہ حمیر کا رخ کیک کی سمت کرتے
ہوئے سوالیہ انداز میں گویا ہوئی۔ ”اس کے بعد میں
تمہیں فریش ہونے کے لیے صرف دس منٹ کا ٹائم
دینے والی ہوں کیونکہ مجھے بھوک بہت شدید لگ رہی
ہے اور گھر میں کھانے کو آج واقعی کچھ نہیں ہے۔“ وہ
چھری ہاتھ میں پکڑ کر کھلکھلائی۔ ان دونوں نے مل کر
موم بتیاں بجھائیں، کیک کاٹا اور پھر اسے ایک دوسرے
کو کھلایا۔

”میں تمہارے ساتھ اسی طرح اپنی شادی کی
پچیسویں، چالیسویں بلکہ پچاسویں سالگرہ بھی منانا
چاہتی ہوں۔ یونہی تم بھول جاؤ اور یونہی میں تمہیں یاد
دلاؤں۔“

”پچاسویں سالگرہ، یعنی پچاس موم بتیاں۔ پچاس
موم بتیاں کیک پر سائیں گی کیسے؟“
”کوئی مسئلہ نہیں ہے، میں کیک بہت بڑا سا بیک

کی نیچتیں کر کے تم میرے رومینٹک موڈ کا
ستیاں کر رہی ہو۔“ اس وقت وہ چپ ہو گئی تھی مگر وہ
سمجھتی تھی کہ حمیر کے نظرائے انداز کرنے اور ہٹک آمیز
انداز اختیار کرنے کے باوجود جو ادب بھائی ان لوگوں سے
منے آنا اور فون پر خیریت دریافت کرنا کبھی نہیں
بھولتے تھے۔ وہ بھائی کی کامیابیوں پر بہت خوش ہوتے
تھے، انہیں اپنے قابل بھائی پر بڑا فخر تھا۔ حمیر کے
دیویوں کی تلافی کرنے کے لیے وہ خود ان سے بہت
اچھی طرح ملتی تھی۔



میں نہ کل کبھی اس کی زندگی میں شامل رہی تھیں
اور نہ آج تھیں پھر بھی وہ ہفتہ میں ایک بار انہیں فون
ضرور کر لیا کرتی تھی۔ کبھی کسی وجہ سے وہ فون نہ کر پاتی
تھی، مگر اسے خود فون کر کے اس کی خیریت پوچھ لیا کرتی
تھیں۔ تین چار مہینوں بعد وہ کھڑے کھڑے مئی کے
گھر بھی ہو آتی تھی۔

ان کی شادی کی دو سری سالگرہ سے چار ماہ پہلے حمیر کا
یوموشن ہوا تھا۔ اپنی ترقی کی خوشی میں اس نے ماہا کو
بیک پرل کے ایئر رننگز گفٹ کیے تھے۔ اس موقع پر وہ
خوش ٹوٹا تھا مگر ایسا نہیں کہ اس نے کوئی کارہائے نمایاں
سرا انجام دے ڈالا ہو۔ جو معیار اس نے خود اپنے لیے
ٹے کر رکھا تھا، ابھی وہ اس سے بہت دور تھا۔



رات تقریباً ”پونے نو بجے دروازے پر نیل ہوئی
تھی۔ اس نے بھاگتے ہوئے آکر دروازہ کھولا۔ حمیر نے
تھوڑا داخل ہوتے ہی اس کی تیاری کو بغور دیکھا۔
”آج کیا ہمیں کہیں جانا تھا؟ تم نے مجھے یاد کیوں
نہیں دلایا فون پر؟“ وہ اس کی فون کال اور اب اتنی
تندست تیاری دیکھ کر یہی اندازہ لگایا کہ شاید آج وہ
کیپارٹی میں انوائٹڈ ہیں۔

”جانا تھا نہیں، جانا ہے۔ آج تم مجھے باہر ڈنر کرانے
لے جا رہے ہو، کسی بہت اچھی سی جگہ پر کیونکہ آج
میں نے گھر پر کھانا نہیں پکایا ہے، اس لیے۔“ وہ اس کا

کروں گی۔ اتنا بڑا کہ اس پر پچاس موم بتیاں لگائی جاسکیں۔“

وہ اسے ڈنر کرانے لے آیا تھا اور ڈنر کرتے ہوئے وہ دونوں اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ اس کا تحفہ اور کارڈ حمیر کو پسند تو بہت آئے تھے مگر وہ خود اس کے لیے کچھ نہیں لاسکا۔ اس بات پر وہ خاصا شرمندہ تھا۔

”تم نے میری ذرا بھی تعریف نہیں کی۔ تم سے اچھا تو آئینہ ہے جس نے کم از کم مجھے یہ تو بتا دیا تھا کہ میں اچھی لگ رہی ہوں۔“ اپنی ظاہری خوبصورتی سے بے نیاز رہنے والی لڑکی کو اب اپنی تعریفیں سننا اچھا لگنے لگا تھا۔ وہ اس کے شکوے پر مسکرایا مگر بولا کچھ نہیں۔

”حوی! کیا میں اچھی نہیں لگ رہی؟“

”بس ٹھیک لگ رہی ہو۔“ حمیر نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

”بس ٹھیک؟ پتا ہے“ آج میں پارلر میں کتنے پیسے خرچ کر آئی ہوں؟ اور یہ ساڑھی جو میں نے خاص آج کے دن کے لیے خریدی تھی، کتنے کی ہے۔ میری نہیں تو کم از کم اس ساڑھی ہی کی تعریف کر دو۔“ ڈنر کے دوران وہ یونہی اسے اپنی تعریفیں کرنے کے لیے اکساتی رہی اور وہ ”ٹھیک لگ رہی ہو“ کہہ کہہ کر اسے چڑاتا رہا مگر وہاں سے واپس آنے کے بعد جیسے ہی وہ اپنے پارٹمنٹ میں داخل ہوئی، حمیر اس کے شانوں کے گرد ہاتھ رکھ کر اسے اپنے قریب کرتے ہوئے اس کے کان میں مدھم آواز میں بولا۔

”تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو ماہا! اور تمہارے خوبصورت لگنے میں اس ساڑھی کا کوئی کمال نہیں کیونکہ مجھے تو تم ہمیشہ ہی خوبصورت لگتی ہو۔ کبھی یہ سوچنے لگوں کہ اللہ نے مجھے جو کچھ بھی دیا ہے اس میں میرے پاس سب سے قیمتی کیا ہے تو میرے ذہن میں صرف تم آتی ہو۔ تم میرے لیے بہت انمول اور بہت نایاب ہو۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں ماہا!“

”کتنے دنوں بعد آج اتنے دل سے تم نے میری تعریف کی ہے۔“ وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر دھیسے لہجے میں بولی۔

”دنوں کو یاد رکھنے اور انہیں منانے کا یہی فائدہ ہو۔“

”ہم زندگی کی مصروفیات اور بھاگ دوڑ میں الجھ کر اپنے کاموں میں لگ کر خود سے وابستہ ان لوگوں کو جن سے ہمیں بہت محبت ہوتی ہے، اکثر یہ نہیں پاتے کہ ہمیں ان سے کتنی بے تحاشا محبت ہے۔ جیسے آج تم نے کتنے سارے دنوں بعد مجھے یہ بات پھر سے بتائی کہ میں تمہارے لیے کتنی اہم ہوں۔ میں چاہتی ہوں سال بھر میں کم از کم ایک آج کے دن ہم دونوں صرف ایک دوسرے کے لیے ہوں۔ ایک دوسرے کو یہ یاد دلانے کے لیے ہمیں اب بھی ایک دوسرے سے پہلے جتنی ہی محبت ہے۔ گزرتا وقت ہماری محبت میں کمی نہیں بلکہ اس میں اضافہ کر رہا ہے۔“ حمیر نے جیسا کہا تھا وہ واقعی اس کے ساتھ ویسی ہی زندگی گزار رہی تھی۔ انتہائی تیز رفتار، اتنی تیز بھاگتی ہوئی کہ فرصت کے لمحات ان کے درمیان بہت کم آتے تھے۔

”کتنی جلدی دو سال گزر گئے، پتا ہی نہیں چلا ماہا!“

کتنے دنوں بعد آج وہ دونوں اتنی فرصت سے اپنی باتیں کر رہے تھے۔ آج حمیر کی آنکھوں میں نیند اور تھکن نہیں بلکہ صرف محبت تھی اور وہ اس کی یہ بات مان رہا تھا کہ دنوں کو یاد رکھنا چاہیے، انہیں سیلیبوسٹ کرنا چاہیے۔“

”مجھے بہت اچھا لگے گا حوی! جب ایک روز تم مجھ سے کہو گے۔“ کتنی جلدی پچیس سال گزر گئے، پتا ہی نہیں چلا ماہا!“ وہ جواباً قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”بہت جلدی ہے پچیس سال گزارنے کی۔ پچیس سال بعد تم بوڑھی بھی تو ہو جاؤ گی۔ پہلی بار دیکھات کہ کوئی لڑکی اتنی شدت سے بدھالے کی تمہارے کرے۔“ حمیر کے قہقہے میں اس کی ہنسی بھی شامل ہو گئی تھی۔

”اگلے سال میں آج کے دن کو ہرگز نہیں بھولوں گا۔ یکم فروری کو ہی اپنے آفس کے اور گھر کے کلیننگ پر سولہ فروری کی تاریخ کو ہائی لائٹ کروں گا اور گفٹ تمہارے لیے جنوری کے آخر ہی میں خرید کر رکھ دوں گا۔“ وہ جواب میں کچھ کہے بغیر شرارتی مسکان لبوں پر

”میں ناشتہ نہیں کروں گا ماہا!“ اس نے پلٹ کر ہیٹنگر میں سے ٹائی نکالی اور اسے گلے میں ڈالتے ہوئے اسے ایک مرتبہ پھر منع کیا۔
”تم اپنی تیاری کرو۔“

”میں تمہیں کیا کہہ رہی ہوں، ناشتہ تم منہ سے کرو گے اور تیاری ہاتھوں سے۔ دونوں کام ساتھ ساتھ ہو سکتے ہیں۔“ اس کے پاس اس وقت بحث و مباحثہ اور انکار کا بھی ٹائم نہیں تھا، وہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگ کر اپنے ہاتھ سے اسے سینڈویچ کھلاتی رہی۔ بریف کیس میں فائلز سیٹ کر کے رکھتے وہ اس کے ہاتھ سے سینڈویچ کھانے کے ساتھ ساتھ اورنج جوس کا پورا گلاس بھی پی چکا تھا۔ اپنا کوٹ، موبائل اور بریف کیس اٹھا کر وہ کمرے سے باہر نکلا تو وہ اس کا والٹ لے کر تیزی سے اس کے پیچھے آئی۔

”اوہ۔۔۔ تھینکس ماہا! ارے آٹھ دس ہو رہے ہیں، تمہاری وین نکل گئی۔ چلو میں تمہیں ڈراپ کروں۔“ اس کی تیاری میں لگ کر وہ خود آج لیٹ ہو گئی تھی۔

”مجھے ڈراپ کرو گے تو تمہیں اور دیر نہیں ہو جائے گی؟ تم جاؤ، میری فکر مت کرو، میں چلی جاؤں گی۔ ہاں ڈرائیو احتیاط سے کرنا، کبھی دیر ہو گئی کے چکر میں ریش ڈرائیونگ کرنے لگو۔“ وہ دروازے تک اس کے ساتھ ساتھ آئی اور اسے محتاط ڈرائیونگ کی نصیحت کرنا بھی نہیں بھولی۔ دن بھر مختلف کاموں کے پیچھے خوار ہوتے رہنے کے بعد انسان رات گئے تک بھی کاموں ہی میں الجھا رہے اور خود کو آرام نہ دے تو صحت کا کیا حال ہو گا۔ کیسا بے خبر ہو کر گہری نیند سو رہا تھا وہ۔ دیر ہو جانے کے سبب وہ بغیر ناشتہ کیے اپارٹمنٹ کا دروازہ لاک کرتی باہر نکلی تو حمیرا ہی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اس کا دل اسے اتنی گہری نیند سے جگانے پر ذرا خوش نہیں تھا۔ وہ اس کی صحت کا سوچ سوچ کر کڑھ رہی تھی۔



”کل لوگ پی سی میں ڈنر کرتے بڑے خوب

تھے۔ دیکھتی رہی تو وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔
”تیس لگ رہا ہے میں پھر بھول جاؤں گا؟ دیکھ لیں سب کچھ نہیں بھولوں گا۔“
”میں کب کچھ کہہ رہی ہوں، مجھے پتا ہے تم یاد رکھو گے۔ یہ شوخی اور شرارت سے بھرپور مسکراہٹ ہے۔“

رات کو ساڑھے تین بجے تک جاگنے کا اثر یہ تھا کہ صبح کچھ ذرا مشکل سے کھلی۔ روزہ الارم بجنے سے بے رحم نہ کر بیٹھ جاتی تھی جبکہ آج الارم سے بھی مشکل اس کی آنکھ کھلی۔ حمیرا بے خبر سو رہا تھا۔ اس کے منہ پر بکھرے بالوں کو اپنے ہاتھوں سے پیچھے ہٹاتے ہوئے اس نے اسے آواز دی۔ اس نے اپنی سوئی سوئی کھینچ کھول کر اسے دیکھا تو وہ اسے اٹھنے کا کہہ کر اس میں کلپ لگاتی بستر سے اٹھ گئی۔ صبح وہ اپنی تیاری اور ناشتے کی تیاری ساتھ ساتھ کرتی تھی۔
”ٹیم کی پلیٹ ٹیبل پر رکھ کر وہ تیزی سے کمرے میں آئی تو وہ ہنوز بے خبر گہری نیند سوتا نظر آیا۔
”وہ مائی گاڈ۔“ اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔

”حوی! دیر ہو گئی، اٹھو۔“ اس نے زور سے اس کے کندھے کو ہلایا۔

”کال فون سننے ہی وہ فوراً اٹھ بیٹھا اور جیسے ہی اس کی نگاہ گھڑی پر گئی وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں بستر سے اٹھ کر مار کراڑا اور بغیر کچھ کہے سیدھا ہاتھ روم میں گھس گیا۔ کپڑوں کے ساتھ ہی ہیٹنگر میں ٹائی بھی لٹا کر وہ انہیں بیڈ پر رکھ کر باہر نکلی اور تیزی سے ناشتہ کرنے پر توجہ دے دی۔ وہ ناشتہ لے کر کمرے میں واپس آئی تو وہ ہڑبونگ مچائے شرٹ کے بٹن بند کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے والٹ میں سے کچھ

دیر ہو گئی، میں ناشتہ بالکل نہیں کر سکتا۔ اتنی صبح تھک میٹنگ ہے۔ آج تو مجھے آٹھ سے بھی پہلے اٹھنا پڑے گا۔“ وہ اس کے ہاتھ میں ٹرے دیکھ کر غجالت سے انداز میں بولا۔ وہ سینڈویچ اٹھا کر اس کے پاس

صورت لگ رہے تھے۔“ فائز اس کے کیبن میں داخل ہونے کے بعد اس کی میز کے آگے سے کرسی گھسیٹ کر اس پر دھم سے بیٹھتے ہوئے بولا۔ وہ یونہی شور مچاتا اور ہنگامے کرتا تھا۔ وہ کمپیوٹر پر اپنے کام میں مصروف تھی اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تم میری جاسوسی کس خوشی میں کر رہے تھے؟“ فائز عبید آئی بی اے میں اس کے ساتھ تھا۔ کمپیوٹر اسٹڈنٹ کی طرف ہونے کی وجہ سے وہ ماہا کا کلاس فیلو تو ہرگز نہیں تھا مگر چونکہ وہ کلثوم کا فریٹ کزن تھا اور اس کے ساتھ اس کی دوستی بھی بہت تھی اسی لیے وہ وہاں اکثر ان لوگوں کے پاس آتا رہتا تھا۔ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بلا کا بذلہ سنج اور حاضر جواب تھا۔ اپنی ریزرو رہنے والی عادت کے برخلاف اس کی فائز سے آئی بی اے میں ان کی ملاقات کے چند ہفتوں ہی میں دوستی ہو گئی تھی بلکہ یہ کہنا غلط ہے کہ اس نے دوستی کی تھی وہ خود ہی اپنے بے تکلف انداز سے اس کا دوست بن بیٹھا تھا اور یہ محض اتفاق تھا کہ جب ماہا نے یہ کمپنی جوائن کی تب اس سے ایک ماہ قبل ہی وہ بھی اسی کمپنی کو جوائن کر چکا تھا۔

اپنے پیپا کے ٹھیک ٹھاک قسم کے بزنس اور ان کی کمپنی کو چھوڑ کر اس نے یہاں صرف اس ضد میں ملازمت اختیار کی تھی کہ وہ اپنے مما پاپا اور تمام قریبی احباب کو جنہیں اس کی صلاحیتوں پر اگر کچھ شبہ تھا تو یہ دیکھ کر دور ہو جائے کہ وہ اپنی قابلیت کے بل بوتے پر ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں با آسانی ملازمت حاصل کر سکتا ہے۔

وہ یہاں سسٹم اینڈ انٹرنیٹ کی پوسٹ پر کام کر رہا تھا مگر ڈیپارٹمنٹ الگ ہونے کے باوجود وہ اکثر اس کے پاس آجایا کرتا تھا۔

”میں نے تمہیں نہیں دیکھا تھا۔ ویسے تم نے اگر مجھے دیکھ لیا تھا تو آکر ملے کیوں نہیں؟ میں تمہیں حمیر سے ملواتی۔“ مونیٹر سے نظریں ہٹا کر اس نے فائز کو دیکھا۔

”جس بندے سے میں دن کے چوبیس میں سے

سترہ گھنٹے جلتا رہتا ہوں اس سے مل کر کیا کرتا۔ ویسے سات گھنٹے میں نے سونے والے مائنس کیے ہیں۔“ فائز کو اپنی انگلیوں سے بجاتا افسردگی سے بولا۔ ”میں بے چارہ تو سوچتا ہی رہ گیا کہ ذرا ایم بی اے مکمل کر لوں اور کوئی معقول سی جاب حاصل کر لوں پھر اس لڑکی سے حال دل کہوں گا مگر وہ بندہ تو مجھ سے کہیں زیادہ اسمارٹ نکلا۔ لے اڑا ہمارے انسٹی ٹیوٹ کی سب سے خوب صورت لڑکی کو۔“ اپنی بے تکلی باتوں کے دوران وہ ٹھنڈی آپس بھرنا نہیں بھولا۔

”ذرا کسی دن میرے میاں کے سامنے کرنا یہ بکواس۔ وہ اچھی طرح تمہاری مزاج پر سی کرے گا۔“

”اچھا اچھا اب اپنے اس ہیرو کے ڈراوے مت“ مجھے ویسے وہ بندہ تمہاری کچھ قدر شدر کرتا بھی ہے یہ نہیں۔ کلثوم کہتی ہے مشکل ہے کہ یہ لڑکی کسی جگہ لوگوں کو اپنی اہمیت کا احساس دلا سکے۔ ذرا وقتاً فوقتاً جتنی رہا کرو محترم کو کہ وہ دنیا کے خوش قسمت ترین انسان ہیں، جنہیں اتنی اچھی بیوی ملی ہے۔“ وہ پکی سیلیوں والے انداز میں اسے گر کی باتیں سکھانے لگا۔

”وہ خوش قسمت ہے یا نہیں، یہ تو نہیں معلوم مگر میں واقعی بہت خوش قسمت ہوں جو مجھے حمیر جیہ شوہر ملا ہے۔“ دوبارہ مونیٹر کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے وہ بہت سنجیدہ اور پریقین لہجے میں بولی۔

”اب تم اس طرح میری طرف کیا دیکھ رہے ہو۔ تمہیں کچھ اپنا کام وام ہے بھی یا نہیں۔“ وہ پرنٹر پر توجہ لگا رہی تھی۔

”جیلس ہو رہا ہوں اس بندے سے جس کے ہر وقت گن گاتی ہو اور دعا کر رہا ہوں کہ وہ تم جیہ اچھی لڑکی کی ہمیشہ قدر کرے اور جناب! کاموں کا ہے کہ لنچ ٹائم ہو چکا ہے میں یہاں سے گزرتے ہو۔ آپ کے کیبن کے پاس اسی لیے رکا تھا کہ لنچ ہو جانے کی اطلاع دے سکوں۔“ وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”چلو گی میرے ساتھ لنچ کرنے؟“

”نہیں میں نے اپنے لیے پیس پر سینڈویچ اور

کرنے اور دیگر ضروری گھریلو کاموں سے فارغ ہونے کے بعد وہ حمیر کے لیے گلاس میں دودھ لے کر کمرے میں آگئی۔ وہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا۔ اسے اس کی صبح کی وہ گہری نیند ابھی بھولی نہیں تھی، اس لیے دودھ کا گلاس اس کے قریب رکھ کر خفگی سے گویا ہوئی۔

”آج تم دیر تک جاگ کر کوئی کام نہیں کرو گے۔ دودھ پیو، دانت برش کرو اور اچھے بچوں کی طرح لیٹ کر سو جاؤ۔ یہ کام کبھی بھی ختم نہیں ہو گا، ہاں اس کے چکر میں تمہاری صحت ضرور خراب ہو جائے گی۔“ وہ بڑی تیز رفتاری سے کی بورڈ پر انگلیاں چلا رہا تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنا مصروف تھا کہ اس نے نہ اسے سر اٹھا کر دیکھا اور نہ پاس رکھے دودھ کے گلاس کو۔

”حوی! میں تم سے بات کر رہی ہوں۔“
 ”میں نے سن لیا ہے ماہا! میں دودھ پی لوں گا۔ تم پلیز مجھے ڈسٹرب مت کرو۔ یہ رپورٹ بہت اہم ہے اور مجھے اسے آج ہر قیمت پر مکمل کرنا ہے۔“ اس نے لمحہ بھر کے لیے اپنے سامنے رکھے صفحات اور کی بورڈ سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔ ”میرے مطلب کا کام کوئی اور نہیں کر سکتا۔ یہ رپورٹ احسان کے حوالے کر دی تھی اور دیکھو ذرا کیا حشر کیا ہے محترم نے اس کا۔“ اس نے اپنے سامنے رکھے صفحات کا پلندہ ہاتھ میں اٹھا کر بہت غصے سے اسے دکھایا۔

”اتنا کام تو میں بھی کر سکتی ہوں حوی! اور یقین کرو، میں بالکل تمہارے مطلب کا کام کروں گی۔ تمہارے لیے آج پوری نیند سونا بہت ضروری ہے۔ پچھلے کتنے سارے دنوں سے تم ڈھنگ سے پوری نیند سوئے تک نہیں ہو۔ خدا کے لیے رحم کرو اپنے حال پر۔“ اس نے اسے ہاتھ پکڑ کر کرسی پر سے اٹھانے کی کوشش کی۔

”تم۔۔۔ لیکن ماہا۔۔۔“
 ”لیکن ویکن کچھ نہیں، یہ کام میں کر دیتی ہوں اور یقین رکھو تمہارے احسان صاحب جیسی کوئی گڑبڑ میں نہیں کروں گی۔“ اس نے اسے زبردستی وہاں سے اٹھا دیا اور پھر ضد کر کے اسے بستر پر لیٹ جانے پر بھی مجبور

کرتا ہوا لیا ہے۔“ اس نے قطعیت سے انکار کیا۔
 ”تمہاری اپنی قسمت کہاں کہ مسز ماہا حمیر رضا کے ساتھ لچ یا ڈنر کریں۔ لڑکی تم نے مسز بننے میں جلدی کی ہے۔“

”کافز! تم یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ، ورنہ میں بھی زارا کو فون کرتی ہوں۔“ اس نے مصنوعی ناراضی سے اسے گھورتے ہوئے زارا کا نام لے کر اسے دھمکایا۔
 ”اس کے انکل کی بیٹی ہونے کے علاوہ اس کی منگیتر بھی تھی اور ایک بہت ہی سنجیدہ اور لمبے چوڑے لو۔“
 ”خیر کے بعد یہ منگنی انجام پائی تھی۔ زارا اور فائز کو تیسویں صدی کا رومیو جولیٹ یا لیلیٰ مجنوں بڑے ترس سے کہا جاسکتا تھا۔“

”جارہا ہوں بھی! ویسے کچھ اڑتی اڑتی سی خبر سنی تھی میں نے، کسی مسز ماہا حمیر کے پروموشن کے حلق۔“ وہ دروازے کی طرف جاتا ہوا سرسری سے بچے میں بولا۔

”وافعی، تم سچ کہہ رہے ہو۔ کس سے سنا تم نے؟“
 ”اپنا سب کام چھوڑ چھاڑ خوشی و بے یقینی کی ملی جلی کیفیت میں اس سے پوچھنے لگی۔ وہ اس کی بے قراری پر مسکرایا۔

”بھی تو ہمیں نکالا جارہا تھا۔ سچ ہے یا،! یہ دنیا ہے جی مطلب کی۔“

”اچھا صاف صاف بتاؤ ساری بات۔“ وہ واپس اس کے پاس آکر اسے اس کے مطلوبہ سوالوں کے جواب دینے لگا۔

رات کو ڈنر کرتے ہوئے اس نے اپنے ممکنہ پروموشن کی خبر حمیر کو بھی سنائی جس عہدے پر اسے ملنے کا امکان تھا اس کے عہدے پر ترقی پانے والے ممکنہ دو امیدوار اور بھی تھے۔

”میں نے تم سے کہا تھا نا کہ یہ کیریئر والی جاب ہے۔ یہاں تم نے اپنی جگہ بنالی ہے، اب دیکھنا تم کتنے آگے تک جاؤ گی۔“ حمیر ڈنر کے دوران اس کی جاب کے بارے میں متعلق باتیں کرتا رہا۔

”جین سمیٹنے، اپنے اگلے دن پہننے والے کپڑے استری

آئی تھی۔ لفٹ سے اتر کر اس کی نگاہ ریکا پر پڑی۔ ان کی بلڈنگ کے فرسٹ فلور پر رہنے والی جاپانی میاں بیوی کی دو سالہ بیٹی۔ باوجود اس کے کہ اس وقت اس کی دین آنے کا ٹائم ہو رہا تھا پھر بھی وہ ریکا کو پیار کیے بغیر وہاں سے کیسے جاسکتی تھی؟ وہ اتنی چھوٹی سی اور اتنی پیاری سی تھی۔ واقعی جاپانی گریا اور جب اپنی ماں سے ہاتھ چھڑا کر وہ تیز تیز چلتی تو اس کا دل چاہتا وہ گود میں اٹھا کر اسے خوب ہی پیار کرے۔ اس کی جاپانی پڑوس اپنے مخصوص تہذیبی انداز کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے سامنے کچھ جھکی اور پھر اس کی خیریت دریافت کی۔ اس نے بھی جواباً اس کی خیریت پوچھی اور اس دوران ریکا کو گود میں اٹھا کر جلدی سے اس کے دونوں گالوں پر پیار بھی کر لیا تھا۔

آفس میں ایک اور مصروف ترین دن اس کا منتظر تھا پھر آج تو آفس سے واپسی میں سیدھے اپنے اپارٹمنٹ جانے کی بجائے اسے کلثوم کے گھر جانا تھا۔ کلثوم کے جڑواں بچوں کی پہلی سالگرہ اور عقیقہ کا فنکشن ایک ساتھ ہوا تھا اور اس تقریب میں کلثوم نے اپنے شوہر کے ساتھ ان کے گھر پر آکر بڑے خلوص سے اسے اور حمیر کو انوائٹ کیا تھا۔ وہ وہاں جانا چاہتی تھی مگر حمیر کے پاس اس روز بالکل فرصت نہیں تھی۔ اس نے کلثوم کے جانے کے بعد حمیر سے وہاں چلنے کے بارے میں پوچھا تو اس نے اپنی مصروفیت کا بہانہ کر دیا۔

رات کے وقت وہ اکیلی تو نہیں جاسکتی تھی۔ اسی لیے اسے اپنا جانا بھی ملتوی کرنا پڑا تھا۔ کلثوم سے اس نے فون پر معذرت کر لی تھی مگر وہ جانتی تھی کہ اس نے اس کے نہ آنے پر بہت برا مانا ہوگا اس لیے تب ہی اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنی پہلی فرصت میں کلثوم کے گھر اس کے بچوں کے لیے گفٹس لے کر ضرور جائے گی۔ حمیر کو وہ کل ہی اپنے آج کے پروگرام سے آگاہ کر چکی تھی۔ وہ اس پر پابندیاں نہیں لگاتا تھا اس لیے اس کے علم میں لائے بغیر بھی کہیں نہیں جاتی تھی۔ آفس دین سے وہ راستے میں پڑنے والے شاپنہ

کر دیا۔ وہ واقعی اتنا تھکا ہوا تھا کہ بستر پر لیٹتے ہی ادھر اس کی آنکھیں بند ہوئیں اور ادھر وہ گروپیش سے غافل گہری نیند سو گیا اس کی نیند کو کمرے کی جلی ہوئی لائٹ تک ڈسٹرب نہیں کر رہی تھی۔ وہ اگرچہ بڑی احتیاط سے کام کر رہی تھی۔ کسی قسم کا کوئی شور بھی پیدا نہیں ہونے دے رہی تھی مگر پرنس لیتے وقت پرنس کا مخصوص شور جب سنائے میں گونجا تو اس نے فوراً پلٹ کر حمیر کو دیکھا وہ اسی طرح بے خبر سو رہا تھا۔ یوں جب وہ تمام صفحات کے پرنٹ آؤٹس لینے اور کمپیوٹر بند کرنے کے بعد بستر پر آئی تو سوا چار بج رہے تھے۔ اس کی آنکھ لگنے والی تھی جب سوتے میں حمیر نے کروٹ بدلی اور اس کا ہاتھ ماہا کے کندھے سے ٹکرایا۔

”کام ہو گیا ماہا؟“ اس نے غنودگی میں اس سے پوچھا۔ تھکاوٹ کے شدید احساس اور نیند کے غلبے کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آگئی۔ سوتے میں بھی اسے اپنے کاموں ہی کی ٹینشن تھی۔

”سو تو سکون سے جایا کیجئے مسٹر حمیر رضا! ہاں ہو گیا۔“ اسے اطمینان دلاتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

صبح اس کی آنکھ اپنے مقررہ وقت پر کھل گئی تھی اور اٹھتے ہی اسے یوں لگا تھا جیسے ابھی تو آنکھ لگی تھی۔ آج حمیر صبح وقت پر جاگ گیا تھا۔

”تھینک یو ماہا!“ حمیر نے کھڑے کھڑے رپورٹ پر نگاہیں دوڑائیں اور پھر مطمئن ہو جانے والے انداز میں اسے اپنے برف کیس میں رکھ دیا۔

”تم مجھے اپنی سیکریٹری اپائنٹ کر لو میں تمہارا سارا کام بالکل ٹھیک کیا کروں گی تمہاری مرضی کے مطابق۔“

”اتنی خوب صورت اور اتنی ذہین سیکریٹری پھر تو میں گھر آیا ہی نہیں کروں گا۔ سارا وقت آفس میں رہا کروں گا۔“ وہ ماہا کے شرارتی انداز کے جواب میں ہنستے ہوئے بولا۔

وہ آفس جانے کے لیے اپنے اپارٹمنٹ سے نکل

”کبھی یہ حمیر رضا فرصت سے میرے ہاتھ لگے تو میں اسے خوب کھری کھری سناؤں۔ میری اتنی پیاری اور نازک سی دوست کا کیا حشر کر دیا ہے اس نے۔“

”ایکسیکو زمی“ آپ میرے منہ پر میرے میاں کی برائی کر رہی ہیں۔“ اس نے کلثوم کو گھورا، مگر وہ اس کے گھورنے سے ذرا متاثر نہیں ہوئی۔

”اس کے پاس تمہارے لیے کوئی ٹائم نہیں بڑی مصروف شخصیت ہیں موصوف۔ تم میرے گھر فنکشن پر آنا چاہتی تھیں مجھے اچھی طرح پتا ہے۔ مگر وہ جو منشر لگے ہیں ان کے پاس بیوی کو اس کی اکلوتی سہیلی کے گھر لے جانے کا وقت نہیں تھا اور آج تم اتنی شام گئے یہاں اکیلی آئی ہو اور اکیلی ہی جاؤ گی۔ اسے تمہاری کچھ پروا ہے بھی کہ نہیں؟“ وہ حمیر کے خلاف کوئی بات نہیں سن سکتی تھی اسی لیے اس کے چہرے پر ناگواری سے بھرپور تاثر پھیل گیا۔

”پلیز کلثوم۔“ اس نے سخت لہجے میں کلثوم کو ٹوکا۔ ”مجھے تمہاری فکر ہے ماہا! اور یہ بندہ پتا نہیں کیوں مجھے ویسا نہیں لگتا جیسا تم اسے بتاتی ہو۔ بہت چالاک اور خود غرض لگتا ہے یہ مجھے۔ تمہیں فورس کر کے اس نے جاب کرواتا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ جاب کرنا برا ہے۔ مگر شادی کے بعد یہ میری مرضی ہے کہ میں نوکری کروں یا نہیں۔ میرا تمام تر خرچ اٹھانا اور ساری ضروریات پوری کرنا میرے شوہر کی ذمہ داری ہے۔ کما کر لانا مرد کی ذمہ داری اور گھر خوش اسلوبی سے چلانا عورت کی ذمہ داری۔ جب ایک مرد ایک عورت کو اپنے نکاح میں لیتا ہے تو پھر وہ اس کے نان نفقے اور تمام اخراجات کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ میں نہیں کہہ رہی یہ ہمارے مذہب نے ہمیں بتایا ہے۔ تم اس کے مجبور کرنے پر اس کے ساتھ برابر کا کما رہی ہو اور اس کے پاس تمہیں دینے کے لیے وقت تک نہیں؟ پاکستان میں رہتے ہوئے تم دونوں امریکن اسٹائل کی زندگی گزار رہے ہو۔“

”بس کرو کلثوم! تم حوی کے خلاف یہ ساری بکواس اس لیے کر رہی ہو کہ میں تمہارے بچوں کے فنکشن

سنٹر پر اتر گئی۔ بچوں کے کھلونوں کی دکان کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ اگر اسے کلثوم کے گھر پہنچنے کے جلدی نہ ہوتی تو وہ ابھی مزید کچھ وقت یہاں رکھے کھلونوں کو دیکھتے ہوئے بتا دیتی۔

وہ کلثوم کے گھر پہنچی تو وہ غیر متوقع طور پر اسے اپنے سامنے دیکھ کر اتنی خوش ہوئی کہ اپنی ساری ناراضی بھلا کر والہانہ پن اور گرم جوشی سے اسے گلے سے لگالیا۔ اسے شاید ماہا کے آنے کی امید نہ تھی۔ ”اکیلی آئی ہو؟“ جواباً ”سراشات میں ہلا کر وہ اس کی گود سے اس کی بیٹی کو اپنی گود میں لے کر اسے پیار کرنے لگی۔“

”جو ڈول میں تمہارے لیے لائی ہوں تم تو اس سے بھی زیادہ پیاری ہو گئی ہو۔“ وہ اس کے گالوں پر چٹا چٹ پیار کرتے ہوئے محبت سے بولی۔

”شام کے وقت اکیلی کیوں آئیں ماہا؟ شہر کے حالات اتنے اچھے بھی نہیں ہیں۔“ کلثوم کے چہرے پر اس کے لیے محبت بھری تشویش پھیلی ہوئی تھی۔

”مائی ڈیئر فرینڈ! میں اب یونیورسٹی گرل نہیں رہی۔ شادی شدہ عورت اور ورکنگ وومن ہوں۔ شام کا وقت مجھے کچھ نہیں کہتا۔“ کلثوم نے جواباً ”کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر پھر اپنی ساس کو ڈرائنگ روم میں آتا دیکھ کر قصداً اس ذکر کو چھوڑ کر اس کی اور حمیر کی خیریت پوچھنے لگی۔ چائے کے لوازمات سے میسر ہونے کے بعد وہ فوراً ”گھر واپسی کے لیے اٹھ جانا چاہتی تھی۔“

”میں اتوار کے دن فرصت سے خوب لمبا بیٹھنے کے لیے آتی۔ مگر کیا کروں یار! چھٹی کا دن باقی سارے ہفتے سے بھی زیادہ مصروف گزرتا ہے۔“

”کتنا گھن چکرنا کر رکھا ہوا ہے تم نے خود کو ماہا! ذرا حال تو دیکھو اپنا۔ کیسی کمزور لگ رہی ہو۔ اور آنکھوں کے نیچے اتنے گہرے حلقے جیسے نجانے کب سے پوری فینڈ بھی نہیں سوئیں۔“

”جو آپ سے بہت محبت کرتے ہیں انہیں آپ ہمیشہ ہی کمزور لگتے ہیں۔ وہ کلثوم کے تشویش بھرے انداز پر مسکرا دی۔“

بول دیتی کہ وہ اپنے اپنے سردیوں یا گرمیوں کے کپڑے خریدنے گئی ہوئی تھی۔ گھر کا دوسرا کوئی بھی سامان خریدنے گئی ہوئی تھی تو اس کی ان تمام باتوں کو کلثوم اس انداز اور اس پیرائے میں لے گی نہ صرف یہ کہ لے گی بلکہ انہیں یاد بھی رکھے گی اور اسے بتائے گی بھی۔ اگر اسے اس بات کا تھوڑا سا بھی اندازہ ہوتا تو کبھی بھی اپنے منہ سے روانی اور سادگی میں نکلے ان جملوں کو نہ نکلنے دیتی۔

”محبت... ہونہ۔“ اس کے غصے کا اثر قبول کیے بغیر کلثوم تلخی سے بولی۔ ”مجھے تو تمہاری یہ بات بھی سراسر جھوٹ لگتی ہے ماہا! کہ تم ابھی بچوں کے جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتیں۔ اگر بچے تمہیں ایسا ہی جھنجھٹ اور وبال لگتے تو میرے بچوں کو یوں تڑپ کروالہانہ انداز میں پیار نہ کیا کرتیں۔ جو عورتیں ماں بننے سے اتنی بیزار ہوتی ہیں پھر وہ دوسروں کے بچوں کو اس طرح پیار بھی نہیں کرتیں۔“ کلثوم نے قدرے بے رحمانہ انداز میں یہ بات کہتے وقت ماہا اور اس کی گود میں عشاء کو بغور دیکھا۔ یوں جیسے اسے یہ جتنا چاہتی ہو کہ وہ جب سے یہاں آئی ہے اس کی بیٹی مسلسل اس کی گود میں بیٹھی ہے اور وہ باتوں کے دوران تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کے گالوں اور ہاتھوں پر پیار بھی کرتی جا رہی ہے۔ بے ساختہ اور قطعاً غیر اختیاری طور پر اس نے فوراً ”عشاء کو گود سے اتار کر صوفے پر بٹھا دیا۔“

”میری نجی زندگی میں مداخلت کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے کلثوم! میں کب ماں بننا چاہوں گی اس بات کا فیصلہ میں اور میرا شوہر مل کر کریں گے، تمہیں اس بارے میں فکر کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے اپنے یہاں آنے پر۔ نہ میں آنے تمہارے گھر آئی اور نہ تم حوی کے خلاف میرے منہ پر یہ فضول بکواس کرتیں۔“ وہ یک دم ہی صوفے سے اٹھ گئی۔

”تم ناراض ہو جاؤ یا برا مانو، مگر میں کیا کروں ماہا! تمہاری دوست ہوں۔ تم مجھے بہت عزیز ہو۔ میں

نہیں آسکی اور اس روز جب تم مجھے انوائیٹ کرنے آئی تھیں تب اس نے تم لوگوں کو یہ کہہ دیا تھا کہ وہ تم لوگوں کے آنے سے پہلے کہیں جانے کے لیے نکلنے والا تھا۔ وہ تم لوگوں کو انور نہیں کرنا چاہ رہا تھا، وہ واقعی ایک بہت اہم ڈنر میں جانے کے لیے لیٹ ہو رہا تھا۔“ حمیر کے یہ کہنے کے بعد کہ وہ کہیں جا رہا تھا، کلثوم اور اس کا شوہر پھر ان کے گھر پر زیادہ دیر نہیں رکے تھے۔ اسے خود محسوس ہوا کہ کلثوم کو حمیر کا روکھا پھیکا انداز برا لگا تھا۔ تب حمیر کے رویے سے اسے بھی رنج ہوا تھا مگر وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ جس ڈنر میں جانے کے لیے وہ لیٹ ہو رہا تھا وہ اس کے پروفیشن کے حوالے سے اس کے لیے کس قدر اہم تھا۔

”تمہیں کیا معلوم وہ مجھ سے کتنی بے تحاشا محبت کرتا ہے۔ ہر انسان میں کچھ نہ کچھ خامیاں ہوتی ہیں کیا تم میں اور مجھ میں نہیں؟ وہ اپنے پروفیشن اور اپنے کیئریر کو بہت سنجیدگی سے لیتا ہے اور میں اسے برائی ہرگز نہیں سمجھتی۔ بس اسی وجہ سے اس کے پاس کسی اور کے لیے تو کیا خود اپنے لیے بھی وقت نہیں ہوتا۔ پھر وہ تمہارے میاں کی طرح نہیں کہ باپ کے ترکہ میں اسے ایک گھر اور دولت جائیداد مل گئی ہو۔ نہ اسے اپنے ماں باپ کی طرف سے وراثت میں کچھ ملا ہے اور نہ مجھے۔ ہم دونوں کو مل کر اپنا ذاتی گھر بنانا ہے۔ ہمیں اپنی زندگی خود بنانی اور خود سنوارنی ہے ماں باپ کی طرف سے کسی سپورٹ کے بغیر۔ اگر اس مقصد کے حصول کے خاطر میں اس کے ساتھ مل کر جدوجہد کر رہی ہوں تو کس کے لیے؟ اپنے ہی لیے نا۔ اپنے ہی گھر کے لیے اس میں کیا برائی ہے؟ اور اس کی محبت جس پر تمہیں شک ہے اس میں نہ کل میرے لیے کوئی کمی تھی اور نہ آج ہے۔ وہ پورا کا پورا میرا ہے۔“ اسے کلثوم کی باتیں بہت بری لگی تھیں۔ اسی لیے وہ اپنے لہجے میں در آنے والے غصے پر قابو نہیں رکھ پائی تھی۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ کبھی کلثوم کا فون آنے پر وہ گھر پر نہ ہوتی اور پھر دوبارہ کبھی اسے فون پر بات ہونے پر اپنی غیر موجودگی کی وجوہات کے سلسلے میں یہ

خوش اور مطمئن فیملی کی ٹھیک ٹھاک سپورٹ ہونے کے باوجود نہ اسپیشلائزیشن کیا نہ اپنا کچھ اچھا سا سیٹ اپ بنایا۔ وہی کنویں کے مینڈک۔ اعلا تعلیم یافتہ بیوی کو بھی گھر بٹھالیا کہ چلو تم میرے کمائے چند ہزار روپوں میں ہنسی خوشی گزارا کرو۔

گھر آنے کے بعد تھوڑی دیر وہ کلثوم کی باتوں پر اپنا خون جلاتی رہی۔ پھر اس پر اور اس کی باتوں پر لعنت بھیج کر وہ منہ ہاتھ دھونے اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد کچن میں آگئی۔ آج دیر ہو گئی تھی اس لیے زیادہ اہتمام کرنے کا وقت نہیں بچا تھا۔ کام کے دوران ہی فون کی گھنٹی بجی۔

”ہو گئی اپنی سہیلی سے ملاقات؟“ حمیر کی آواز سننے ہی اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔
 ”ہاں۔ اب تو مجھے واپس آئے بھی کافی دیر ہو گئی۔ تم کب آرہے ہو؟“ کارڈلیس کندھے کے سہارے کان کے پاس نکائے وہ ہنوز سب کاٹنے میں مصروف تھی۔

”یہی بتانے کے لیے میں نے فون کیا ہے۔ مجھے دیر ہو جائے گی۔ تم کھانے پر میرا انتظار مت کرنا۔“
 ”اور جو میں تمہارے لیے اتنی زبردست سوٹ ڈش تیار کر رہی ہوں اس کا کیا ہو گا؟“

”نہیں آکر کھالوں گا۔ پلیز یار سمجھا کرو۔ ارسلان صاحب نے ایک کام میرے سپرد کیا ہے۔ تمہیں پتا ہے نامیں انہیں انکار نہیں کر سکتا۔“

”ہاں مجھے پتا ہے اور تمہیں مجھے صفائیاں دینے اور وضاحتیں پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم اطمینان سے اپنا کام کرو مگر رات میں بہت زیادہ دیر بھی مت لگاؤ اور گھر واپسی میں احتیاط سے گاڑی ڈرائیو کرنا۔ جب دیر ہو جاتی ہے پھر تم بہت تیز ڈرائیونگ کرتے ہو۔“ وہ حسب عادت اسے یہ نصیحت کرتا نہیں بھولی۔ ارسلان ایاز نے حمیر کو کوئی دفتری کام سونپا تھا یا ذاتی وہ نہیں جانتی تھی مگر اسے اتنا بہر حال معلوم تھا کہ حمیر ان کے ذاتی نوعیت کے کام بھی اکثر کر دیا کرتا تھا۔ ان کی فیملی امریکہ سے آرہی ہے وہ خود تو اسلام

سے بہت پیار کرتی ہوں اور میرا یہی پیار مجھے تمہاری فکر کرنے پر اکساتا ہے۔ میں تمہیں کتنے سمجھاؤں کہ اس شخص پر یوں اندھا بھروسہ مت کرو۔ پتا نہیں کیا ہے مگر میری چھٹی حس کہتی ہے یہ ویسا نہیں جیسا دکھتا ہے۔ اس روز جب سے میں تمہارے گھر سے آئی ہوں تب سے تم سے یہ بات کہہ رہی ہوں مابا! کہ اس شخص پر اتنا اعتبار مت کرو۔ اندھا بھروسہ تو کسی بھی بیوی کو اپنے شوہر پر نہیں کرنا چاہیے اور تم۔ تم تو خاص طور پر وہ بندہ جو تمہارے ساتھ امریکن اسٹائل کی زندگی گزار رہا ہے تم اس پر آنکھیں بند کر کے اعتبار مت کرو۔ اپنی ساری کمائی بے دریغ خرچ مت کر دیا کرو۔ ایسا تو وہ بیویاں بھی کرتی ہیں جو شوہر ہی کی کمائی پر گزارا کرتی ہیں۔ وہ بھی شوہر ہی کے دیے پیسوں میں سے شوہر کو خبر دیے بغیر کچھ نہ کچھ پیسے بس انداز کر کے ضرور رکھتی ہیں۔

مردوں کی قوم پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے مابا! یہ محبت کا نام لے کر ہمیشہ عورت کو بے وقوف بناتے ہیں اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔“ کلثوم اس کے قریب آکر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر رسانییت سے بولی۔

اس نے شدید غصے کے عالم میں کلثوم کے ہاتھ جھٹک دیے۔ کلثوم سے بہت ناراض اور بے انتہا خفا وہ اس وقت وہاں سے واپسی کے لیے اٹھ گئی مگر کلثوم نے اسے اکیلے واپس جانے نہیں دیا۔

وہ اپنے شوہر کے ساتھ گاڑی میں اسے اس کے لپارٹمنٹ تک چھوڑ کر گئی تھی۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے کلثوم کا۔ جو منہ میں آتا ہے بے جا جاتی ہے۔ خود کے میاں نے گھر داری کرنے، بچے پالنے اور اپنی ماں کی خدمت کروانے کے لیے اسے گھر پر بٹھا کر رکھا ہے اس لیے اسے جاب کرنے والی ہر شادی شدہ لڑکی مظلوم اور اس کا شوہر ظالم نظر آتے ہیں۔ حوی اس روز صبح تو تبصرہ کر رہا تھا اس کے میاں کے بارے میں۔ ایک سیدھا سادا MBBS کر کے اپنی گورنمنٹ جاب سے

تھے اور وہ پھر بھی خود کو بدل نہ سکی۔



”تم تھوڑا سا پہلے مجھے بتا دیتے تو مجھے بہت آسانی ہو جاتی حوی!“

”در اصل میرا ارادہ تو پیٹر اور ان کی مسز کو کسی اچھے سے ہوٹل میں ڈنر کے لیے انوائٹ کرنے کا تھا۔ آج جب میں نے انہیں دعوت دی تو انہوں نے بہت خوشی سے قبول کر لی مگر ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کر دی کہ اگر میں انہیں ڈنر کروانا چاہتا ہوں تو اپنے گھر پر کرواؤں۔ وہ گھر کے بنے ہوئے پاکستانی کھانے کھانا چاہتے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ میں انہیں انکار کیسے کرتا؟“ امریکہ سے حمیر کے بینک کے ایک سینئر عہدیدار اپنی بیگم کے ساتھ پاکستان آئے ہوئے تھے اور ان ہی کو حمیر نے کل رات اپنے گھر کھانے پر انوائٹ کر لیا تھا۔ یہ بات سن کر وہ اس وجہ سے فکر مند اور پریشان ہو گئی تھی کہ اسے اس دعوت کی اطلاع رات دس بجے کھانا کھاتے ہوئے حمیر نے دی تھی۔ یہ حمیر کے ایک سینئر آفیسر کی دعوت تھی اور اس میں ہر چیز بہت بہترین چاہیے تھی۔ کل اسے آفس جانا تھا اور اب رات کے دس بجے وہ دعوت کے لیے درکار سامان کہاں خریدنے پہنچتی۔ اس کا ذہن بہت تیز رفتاری سے سوچ بچار میں مصروف تھا۔ وہ کیا کرے اور کس طرح کرے۔

”کیا سوچ رہی ہو ماہا؟ کیا تم مینیج نہیں کیاؤ گی؟ اگر ایسا ہے تو پھر میں کسی ہوٹل سے کھانا گھر پر منگوا لوں گا۔ اب انہیں گھر پر انوائٹ کر چکا ہوں تو کھانا تو انہیں گھر پر ہی۔۔۔“

”تم فکر مت کرو میں سب کچھ کر لوں گی۔ کسی ہوٹل سے کھانا منگوانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”آریو شیور؟“ حمیر کے استفسار پر اس نے سر اثبات میں ہلادیا۔

حمیر کے سوجانے کے بعد اس نے اپنے قریب ٹائم پیس رکھ کر اس میں چار بجے کا الارم لگایا اور خود بھی

تبدیل میں ہوں گے، اس لیے حمیر ان کی فیملی کو ریسیو کرنے ایئر پورٹ جائے گا، یا انہیں اپنے بیٹے کے لیے کمپیوٹر خریدنا ہے اور چونکہ انہیں اس بارے میں کچھ خاص معلومات نہیں، اس لیے حمیر ان کے بیٹے کے لیے کمپیوٹر خرید کر اسے ان کے گھر پہنچوا بھی دے گا۔ ان سے تعلقات اور دوستی اس کے لیے بہت اہم تھی۔

ان کے کائٹیکس اور ان کا اثر و رسوخ زبردست تھا۔ حمیر برملا اس سے کہتا تھا کہ یہ دور پبلک ریشنگ کا دور ہے۔ آپ صرف اپنی ذہانتوں اور صلاحیتوں کے سہارے وہ سب کچھ نہیں پاسکتے جو کسی پی آر بریڈھالینے سے حاصل کر سکتے ہیں۔

”اسلام آباد میں میرے کوئی چاہے ماے نہیں بچے اور نہ میرا باپ میرے لیے کوئی مضبوط فیملی بیک گراؤنڈ اور اثاثے چھوڑ کر گیا ہے۔ مجھے اپنے آپ کو خود مضبوط کرنا ہے، اپنی مدد آپ کرنی ہے۔ ہمارا ملک تو یہ ہے کہ نا اہل سے نا اہل آدمی اسلام آباد میں کسی چاہے ماے کی مہربانیوں سے اونچی سے اونچی پوسٹ پر براجمان ہو جاتا ہے۔ پھر ہم جو اہلیت بھی رکھتے ہیں قابلیت اور صلاحیت بھی صرف کسی مضبوط بیک گراؤنڈ کے نہ ہونے کی پاداش میں پیچھے کیوں رہ جاتیں؟“ حمیر اکثر اس موضوع پر اس سے اسی طرح کی باتیں کیا کرتا تھا۔ یہ چیز خود اس کے اپنے مزاج کے عکاس تھی مگر اس نے کبھی حمیر سے اس بارے میں بحث نہیں کی تھی۔

اس کے ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ کا بیٹا ہاورڈ سے گریجویشن کر کے آیا۔ ان کے اسٹاف کے تقریباً تمام غزوانے فردا فردا انہیں جا کر مبارک باد دی۔ یہاں تک کہ اس کے بعض کولیکڑ تو ان کے گھر پھول اور سٹائل تک لے کر پہنچ گئے اور اس سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ ایک رسمی سی مبارک باد ہی انہیں ان کے آفس میں جا کر دے آئی۔ ایک بار تو انہوں نے اسے یہ کہہ کر نوک دیا تھا کہ عید پر اس کے سوا ان کے پاس تمام سٹاف ممبرز کے عید مبارک کہنے کے لیے فون آئے

کیبن تک آگیا تھا۔

”تم اکیلے کہاں سے لہج کر کے آرہے ہو؟“

”اکیلا کہاں؟ وہ محترمہ زارا صاحبہ ہیں نا۔ حالانکہ آج میں اتنا بڑی تھا پھر بھی محترمہ نے حکم جاری فرمادیا کہ میرا ہیڈ اسٹ میں لہج کرنے کا موڈ ہے۔ تم لہج ٹائم میں وہاں پہنچو“ میں بھی اپنے کالج سے سیدھی وہیں آجاؤں گی۔ ارے یار! میں کہتا ہوں بندے کو محبت نہیں کرنی چاہیے“ نری خواری ہے۔“

وہ سارے شاپنگ بیگز اس کی میز کے قریب زمین پر رکھتے ہوئے جھنجھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ فائز کے برا مان جانے کے خوف سے اس نے اسے ٹھنکس نہیں کہا تھا۔

آفس وین دیر سے گھر پہنچاتی اسی لیے وہ شام میں خود ہی رکشہ سے گھر واپس آئی اور آتے ہی اس نے اس پھرتی اور تیز رفتاری سے کام شروع کیا جیسے واقعی کوئی مشین ہو کہ کھانے میں سب کچھ بہترین ہوتا چاہیے تھا۔ نوپینتیس پر جب ان کے اپارٹمنٹ کی ڈور بیل بجی تو نہ صرف یہ کہ کھانا پوری طرح تیار تھا بلکہ وہ خود بھی بہترین تراش خراش والا اسٹائلش ساسون پہنے اور ہلکا سا میک اپ کیے تیار تھی۔

خیر مقدمی مسکراہٹ لیے ہوئے دوستانہ انداز کے ساتھ اس نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ وہ دونوں میاں بیوی اگر حمیرا رضا کی بیوی کی خوش اخلاقی اور مہمان نوازی سے متاثر ہوئے تھے تو اس کا پکا پاکستانی کہنے بھی انہیں بہت پسند آیا تھا۔ پیٹری کی بیگم کو اس کی بہن ہوئی کھیر اس قدر پسند آئی تھی کہ بعد اصرار انہوں نے اس سے اس کی ترکیب مانگی۔

”میں امریکہ میں یہ اپنی دوستوں کو بنا کر ضرور کھلاؤں گی۔“ چلتے وقت انہوں نے اس کے پکے کھانوں کی تعریف کرنے کے بعد یہ بات کہی۔

حمیرا انہیں واپس ان کے ہوٹل چھوڑنے چلا گئی۔ جلدی سے لباس تبدیل کر کے برتن سمیٹنے میں مصروف ہو گئی۔ بچے ہوئے سارے کھانے فریزر میں پنچانے کے بعد وہ برتن دھونے لگی۔ مین ڈور کا

لیٹ گئی۔ اس کے اعصاب پر دعوت ایسی سوار تھی کہ الارم بجنے سے پہلے ہی پونے چار بجے اس کی آنکھ کھل گئی۔ حمیرا بے خبر سو رہا تھا، فریزر میں مرغی، مچھلی اور گائے کا گوشت سب موجود تھا اور پھر دعوت بھی فقط وہ ہی افراد کی تھی، اس نے چاروں چولہوں پر ایک ایک کر کے مختلف چیزیں چڑھا دی تھیں۔ سب سے زیادہ احتیاط اسے یہ کرنی پڑ رہی تھی کہ کوئی شور شراب نہ ہو۔ بلکے سے کھٹکے سے حمیرا کی آنکھ ضرور کھل سکتی تھی۔ آفس جانے کے وقت تک جتنا کچھ وہ کر سکتی تھی، اس نے کر لیا تھا۔ ”پیٹر کو ان کے ہوٹل سے لے کر تو میں ہی آؤں گا۔ میں انہیں نو ساڑھے نو بجے سے پہلے گھر نہیں لاؤں گا۔ اتنے میں تیاری کا زیادہ موقع مل جائے گا۔“ وہ اس کے اطمینان دلانے پر مسکراتے ہوئے اپارٹمنٹ سے نکل آئی۔

اسے کیا کیا کرنا تھا؟ یہ سب وہ اب پوری طرح طے کر چکی تھی، اسی لیے جیسے ہی اس کا لہج ٹائم ہوا وہ اپنے آفس سے فوراً نکل آئی۔

لہج ٹائم ختم ہونے میں صرف دو منٹ باقی تھے، جب وہ خوب لدی پھندی اپنے آفس میں داخل ہو رہی تھی۔ فائز کہیں باہر سے لہج کر کے آرہا تھا۔ اس نے اسے اتنے ڈھیر سارے تھیلوں کے ساتھ دیکھا تو اس کے قریب آکر پرتختس انداز میں بولا۔

”خیریت تو ہے؟ کیا آج تم ہم سب کو لیگز کو کوئی سربراہی پارٹی دینے والی ہو؟“

”بلی کو خواب میں چھیپھڑے ہی نظر آتے ہیں۔“ فائز نے جواباً اسے گھورتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے تھیلے پکڑنے چاہے تو وہ جلدی سے بولی۔

”اٹس اوکے فائز! میں اٹھالوں گی۔“

”دوستوں کو ایک سیکنڈ میں پرایا بنانے میں تمہیں بہت مزا آتا ہے ماما حمیرا رضا!“ اس کے انکار کے باوجود اس نے اس کے ہاتھوں سے شاپنگ بیگز لے لیے۔

”حمیرا نے اپنے ایک جاننے والے کو آج دعوت پر بلایا ہے، اسی لیے یہ تھوڑی سی چیزیں خریدنے گئی تھی۔“ وہ لفٹ سے نکل کر اس کے ساتھ اس کے

حمیر نے نئی گاڑی خریدی تھی۔ اپنی نئی گاڑی میں سب سے پہلے اس نے ماہی کو اپنے ساتھ بٹھایا۔ اپنی نئی گاڑی پر خوش ہونے کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ یہ گاڑی بھی وہ گاڑی نہیں جو وہ ڈرائیو کرنا چاہتا ہے۔ اس نے مرسدیز BMW اور نجانے کن کن منگی گاڑیوں کی باتیں کرنا شروع کیں تو وہ بے ساختہ مسکراتے ہوئے اسے ٹوک گئی۔

”حوی! مجھے پتا ہے آسمانوں سے بھی اونچے تمہارے معیار ہیں مگر پلینز کچھ دیر تو اپنی اس خوشی پر پوری طرح خوش ہولو۔“

وہ جواباً ”سراشات میں ہلا کر ہنسا۔“ جو حکم جناب کا۔“ ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد حمیر نے ایک آکس کریم پارکر کے سامنے گاڑی پارک کر دی۔ اندر آکر ایک میز منتخب کرنے کے بعد وہ اس پر بیٹھی تو اس کی نگاہ اپنی میز کے قریب کی ایک میز پر بیٹھی پانچ لڑکیوں کے گروپ پر پڑی۔ وہ پانچوں کی پانچوں اسے اور حمیر کو بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“ اسے کن اکیوں سے ایک میز کی طرف دیکھتے اور مسکراہٹ دباتے دیکھ کر حمیر نے تعجب سے پوچھا۔

”میں ان لڑکیوں کو دیکھ رہی ہوں۔ میرا خیال ہے تم بہت ہینڈ سم لگ رہے ہو اور مجھے بہت ملا متی لگا ہوں سے وہ سب اس طرح دیکھ رہی ہیں جیسے میں اپنے گھروالوں سے چھپ کر تم سے ملنے آئی ہوں۔“ حمیر ملاحظہ ہو جانے والے انداز میں بے اختیار ہنس پڑا۔ ”سچ کہہ رہی ہوں حوی! ان کی نظریں دیکھ کر ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے پتا نہیں مسئلہ کیا ہے میں لوگوں کو شادی شدہ کیوں نہیں لگتی؟“

”یہ افسوس کی بات ہے یا خوشی کی کہ تم ابھی بھی کالج گرل نظر آتی ہو؟“ وہ اس پر ستائشی نظریں ڈالتے ہوئے بولا۔

”وہ بات تو صحیح ہے مگر ہر وقت یہ چیز فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتی۔ اب دیکھو ہمارے جو نئے فائنلس ڈائریکٹر آئے ہیں۔ حالانکہ بے چارے بڑے شریف

تھے کی اسے آواز آئی تھی۔ اسے پتا تھا کہ یہ حمیر ہے، لیکن وہ اپنے کام میں مصروف رہی۔ اندر آنے کے بعد سیدھا کچن ہی میں آیا تھا۔

”ٹینکس ماہا!“ وہ اس کے بالکل پیچھے آکر کھڑا ہوا اور اس کی گردن میں بازو جمائل کر دیے۔

”تم بہت تھک گئی ہو گی نا؟“ مگر کھانا اور پانی سب کچھ تمہارے معیار کے مطابق تھا تو بالکل نہیں تھکی اور اگر کوئی ایک بھی چیز تمہارے معیار سے کم تھی تو واقعی بہت تھک گئی ہوں۔“

”سب کچھ بہت اچھا تھا ماہا! ایک دم پرنیکٹ۔ پیٹر کو گھر بلانے سے مجھے بہت فائدہ ہوا ہے۔ ہوٹل میں ہمارے درمیان یہ بے تکلفانہ فضا کبھی پیدا نہ ہو پاتی جیسی گھر پر ہوتی ہے۔ میں ان کے ساتھ جس طرح کے قریبی تعلقات استوار کرنا چاہتا تھا وہ تمہاری وجہ سے ہو گئے ہیں ماہا! میری ایونز تو تمہاری اور تمہاری گھڑی کی پکی عاشق ہو کر گئی ہیں۔ ابھی راستے میں مجھ سے تمہاری بہت تعریف کر رہی تھیں۔ پیٹر ایونز اور ان کی بیوی کے ساتھ اس بے تکلفی کا سارا کریڈٹ ختم جاتا ہے ماہا!“ وہ اس کے پیچھے سے ہٹ کر اس کے برابر میں آکر کھڑا ہو گیا اور اس کے صابن لگا کر رکھے برتنوں کو دوسرے سنک میں کھنگالنے لگا۔

”ارے تم یہ کیا کرنے لگے؟“ ”تمہاری ہیلپ کروا رہا ہوں۔“ اس نے پلیٹ پانی سے دھو کر سائیڈ میں رکھتے ہوئے اسے جواب دیا۔ ”مجھے کوئی ہیلپ نہیں چاہیے تھوڑے سے تو بہتر ہیں۔ تم جاؤ میں بھی بس دس پندرہ منٹ میں کمرے میں آ رہی ہوں۔“ اس نے فوراً اسے وہاں سے ہٹا دیا۔

”اچھا پھر جلدی سے آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“ اس کے کہنے سے وہ وہاں سے ہٹ گیا اور پھر کچن سے نکلتے ہوئے اسے کمرے میں جلدی آنے کا کہہ کر



ہوں۔“

کسی بہت پرانے اور بہت پیارے دوست کے مل جانے کی سچی خوشی اس کے ہر ہر انداز سے ظاہر ہو رہی تھی مگر حمیر کے چہرے پر کوئی خوشی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اپنے گلے سے لگے اس شخص کو اس نے فوراً ہی خود سے دور ہٹایا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ حمیر کا جواب مختصر اور کسی بھی طرح کے جوش و خروش سے عاری تھا۔ اس شخص نے شاید ابھی اس سرد مہری کو محسوس کیا نہیں تھا۔ اس کی نگاہیں ماہر پڑیس تو سوالیہ انداز میں حمیر کی طرف دیکھا۔

”میری بیوی ہے۔“ حمیر نے خشک لہجے میں تعارف کروایا۔ اس کی نگاہوں اور لہجے میں سرد مہری اور اجنبیت بڑھتی جا رہی تھی اور وہ اس کے پل پل کے ساتھ ہی اس کی مزاج آشنا اس لیے ان نگاہوں کا ایک لمحہ میں محسوس کر چکی تھی۔

”السلام علیکم بھابھی جی!“

”وعلیکم السلام۔“ وہ ہچکچاتے ہوئے بہت ہلکا سا مسکرائی۔

”بڑی خوشی ہو رہی ہے آپ سے مل کر۔ یہ حمیر میرے بچپن کا دوست ہے۔ کبھی اس نے ذکر کیا ہے آپ سے؟ ہم نے پہلی کلاس میں ایک ساتھ داخلہ لیا تھا۔ پہلی سے آٹھویں تک ہم نے ایک ساتھ پڑھا۔ ہمارے اسکول میں بیٹیاں دینی نہیں بالکل نہیں تھیں۔ ہم زمین پر بیٹھتے تھے، میں اور حمیر ہمیشہ برائے بیٹھتے تھے۔ یاد ہے تمہیں حمیر؟“ وہ پہلے اس سے اور حمیر سے مخاطب ہوا۔ حمیر اسے جواب دینے کے بجائے جیب سے گاڑی کی چابی نکالنے لگا۔

”برادر بڑھا کو تھا یہ۔ اپنے گھر پر پڑھنے کی جگہ نہیں ملتی تو میرے ساتھ میرے ابا کی دکان پر آجاتا۔ ابا ہمارے حوالے کر کے شام میں گھر چلے جاتے۔ دکان پر آنے والے خریداروں کو نمٹاتا اور یہ دکان بالکل اندر کونے والی جگہ پر بیٹھ کر پڑھائیاں کرتا۔ ہم رات دیر تک وہیں رہتے۔ ساتھ کھانا کھاتے

آدی ہیں مگر کیا کریں کہ انہوں نے آتے ہی از خود یہ فرض کر لیا کہ میں غیر شادی شدہ ہوں۔ دن میں پانچ دفعہ مجھے اپنے آفس میں بلواتے اور ان میں سے تین دفعہ بالکل غیر ضروری کسی ایسے فضول سے کام کے لیے جس پر سوچنا ان کی پوسٹ کے شایان شان بھی نہیں تھا۔ مجبوراً“ مجھے ان کے سامنے تمہارا ذکر کرنا پڑا۔ یہ بتانا پڑا کہ جی میں خیر سے شادی شدہ ہوں۔ مسز واصف کہہ رہی تھیں کہ اس میں ان بے چارے کا کوئی قصور نہیں۔ میں کیل کانٹے سے لیس غیر شادی شدہ نظر آتی ہوں۔“

وہ آکس کریم کا جچ منہ میں لے جاتے ہوئے بولی۔ وہ جیولری میں فقط تین چیزیں پہنتی تھی جو حمیر نے اسے تحفے میں دی تھیں اور جو اس نے خود اپنے ہاتھوں سے اسے پہنائی تھیں۔

”میں سوچ رہی ہوں گولڈ کی دو چوڑیاں خرید کر ہاتھوں میں ڈال لوں۔ شاید اس سے لوگوں کو میں شادی شدہ لگنے لگوں۔“

”پہلی فرصت میں یہ کام کرو بلکہ میں تو کہتا ہوں تھوڑا سا وزن بھی بڑھا لو اور یہ فائنٹس ڈائریکٹر کا کیا قصہ ہے۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا اس خبیث کے بارے میں؟“ وہ مصنوعی قسم کا غصہ طاری کر کے اس سے بولا پھر اسے ہنستا دیکھ کر خود بھی ہنسنے لگا کر ہنس پڑا۔

وہاں سے باہر نکل کر وہ اپنی گاڑی کی طرف آہی رہے تھے جب فٹ پاتھ پر اپنی دھن میں مگن چلتے ایک شخص کی نگاہ حمیر پر پڑی۔ وہ چلتا چلتا ٹھٹک کر رک گیا۔ چند سیکنڈ اس نے جیسے اسے پہچاننے میں لگائے اور پھر وہیں سے چلا یا۔

”حمیر!“ وہ شخص تیز رفتاری سے بھاگتا سیدھا ان دونوں کے پاس آکر رکا۔ تیز بھاگنے سے اس کا سانس بری طرح پھول رہا تھا اور اس کے چہرے پر والہانہ خوشی بکھری ہوئی تھی۔ وہ بہت پر جوش طریقے سے حمیر سے بغل گیر ہو گیا تھا۔

”کیسا ہے یار تو پہچانا نہیں مجھے، میں غلام عباس

بھی کبھار تو ساری رات وہیں گزار دیتے۔ کیا وقت تھا
بھی۔ ”اسے لگا کہ حمیرا اس شخص سے فوراً پیچھا
کر کسی بھی طرح وہاں سے گاڑی تک پہنچنا چاہتا

اس کے قدم اٹھنے کے لیے بالکل تیار تھے اور زبان
شاید کوئی بد اخلاقی اور بے مروتی سے بھرپور جملہ
نے ہی والا تھا۔ وہ حمیرا کے کچھ کہنے سے پہلے بے
ساختہ بولی۔

”آپ کیا کرتے ہیں غلام عباس بھائی؟“ حمیرا کی
نصیحہ بھری نگاہیں وہ نظر انداز کر گئی۔ وہ سادہ و مخلص سا
شخص اسے اس سلوک کا حقدار قطعاً نہیں لگ رہا
تھا جو حمیرا اس کے ساتھ کر رہا تھا اور جسے وہ اپنی خوشی
اور جوش اور اپنی سادگی میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

”ہم نے کیا کرنا ہے بھابھی جی! گھر کے حالات ایسے
تھے کہ آٹھویں سے آگے پڑھ ہی نہ سکا۔ بس ابا کی
دکان سنبھال لی۔ ابا کی کرائے کی دکان تھی۔ میں نے
اسے خرید لیا۔ بس جی بڑا کرم ہے مولا کا بڑا اچھا گزارا
ہو رہا ہے اور حمیرا تو کیا کر رہا ہے یار آج کل؟ پرانے
گھر سے کیا گیا اپنے پرانے دوست کو بھی بھول گیا۔“
”ماہا! میں گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

حمیرا غلام عباس کو جواب دیے بغیر ماہا سے کرخت لہجے
میں آنے کا کہہ کر گاڑی کی طرف چلا گیا۔ وہ اپنے
جوش و خروش اور خوشی سے نکل کر حیرت اور بے یقینی
سے گاڑی میں بیٹھ جانے والے اپنے پرانے دوست کو
کچھ رہا تھا۔ وہ اس کم تعلیم یافتہ و سادا سے انسان کی
آنکھوں میں پھیلتے دکھ کو دیکھ نہیں سکتی تھی اس لیے
ان کی طرف نگاہیں ڈالے بغیر آہستگی سے بولی۔

”صل میں حمیرا بھی جلدی میں ہیں، ہمیں کہیں
بست ضروری پہنچنا ہے۔ آپ سے مل کر بہت خوشی
ہے غلام عباس بھائی! اللہ حافظ۔“ اسے اس
سے ایسی ندامت محسوس ہو رہی تھی کہ اس کی
حرف کیجے بغیر یہ جملے کہہ کر تیزی سے اپنی گاڑی کے
میں آئی۔

مل پر ایسا بوجھ پڑا تھا جیسے حمیرا نے نہیں خود اسی

نے اس شخص کی تحقیر کی ہے۔ حمیرا لب بھینچے غصے سے
گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کڑختگی اور
غصے کے سوا کوئی تاثر نہیں تھا۔

”حومی!“ اس نے حمیرا کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ حمیرا
نے اس کے ہاتھ کو بہت غصے سے جھٹک دیا۔ ”وہ بے
چارہ اتنے خلوص سے بات کر رہا تھا حومی! وہ ہم سے کیا
مانگ رہا تھا؟“

”جس سے میں بات کرنا پسند نہیں کر رہا تھا اس پر
خلوص پنچھاور کرنے کا تمہیں کیوں شوق ہو رہا تھا؟
ایسے ٹکے ٹکے کے لوگوں سے میری بیوی اخلاق
بگھارے ہو نہ۔ تمہیں کیا نظر نہیں آ رہا تھا کہ میں
اس سے ملنا نہیں چاہتا۔“ وہ بہت ناراضی سے تیز آواز
میں بولا۔

”اچھا آتم سوری۔ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی۔ تم
پلیز اپنا موڈ تو مت خراب کرو۔“ اس کا انداز مکمل طور
پر معذرت خواہانہ اور صلح جوئی والا تھا۔ وہ اپنے جس
فعل پر ذرہ برابر بھی شرمندہ نہیں تھی اس پر سارا
راستہ اسی سے معافی مانگتی رہی۔ اسے منا لینے والی
مسلسل کوششوں اور تسلسل سے معافی مانگتے رہنے
سے یہ ہوا تھا کہ اپنے بیڈروم میں آکر بستر لینے کے
بعد وہ اس سے منہ پھیر کر کروٹ بدل کر نہیں لیٹا تھا۔
جب اس کے برابر لیٹنے سے پہلے اس نے اس کا ہاتھ
سیدھا کیا اور پھر پورے استحقاق کے ساتھ اس پر سر
رکھ کر لیٹ گئی تو اس نے نہ اپنا ہاتھ ہٹانے کی کوشش
کی اور نہ اسے دور ہٹایا۔

”مجھ سے ناراض ہو کر سوؤ گے تو تمہیں نیند
آجائے گی؟“ اس کی ناراضی میں قدرے کمی ہوئی دیکھ
کر اس کے اوسان بحال ہوئے تھے۔ حمیرا کے لبوں پر
ہلکی سی مسکراہٹ ابھرتی دیکھ کر سکھ کا سانس لیتے اس
نے خود سے ہزار دفعہ کا کیا وعدہ ایک مرتبہ پھر کیا۔



اپنی ترقی کی خبر پر وہ بہت خوش تھی اور اس رات وہ
حمیرا کے ساتھ خوشی خوشی اپنی ترقی ہی کو ڈسکس کیے

جاری تھی۔ اب اس کی تنخواہ میں کتنا اضافہ ہو جائے گا۔ دیگر کیا کیا مراعات اسے مزید ملنے لگیں گی مگر وہ اس کی باتوں میں اس طرح دلچسپی نہیں لے رہا تھا جیسی کہ عموماً لیا کرتا تھا۔ وہ ایک دو دن سے ہی ماہا کو کچھ چپ چاپ سا اور الجھا ہوا لگ رہا تھا۔

”کیا بات ہے حوی! تم مجھے پرسوں شام سے ہی خاموش اور الجھے ہوئے لگ رہے ہو۔“

”کچھ نہیں ہوا۔ خواہ مخواہ تمہیں وہم ہو رہا ہے۔“
”وہم؟ اچھا تم مجھے یہ بتاؤ ابھی میں تم سے کیا کہہ رہی تھی؟“

”تم اپنے پروموشن کی بات کر رہی تھیں۔“
”جی نہیں وہ بات تو میں ختم بھی کر چکی تھی۔ میں تو اب یہ بات کر رہی تھی کہ آج ہمیں کوئی اچھی سی مووی دیکھنی چاہیے۔ کل چھٹی بھی ہے اور پھر ہمیں ایک ساتھ فلم دیکھے بہت دن بھی ہو گئے ہیں۔“

”آج نہیں ماہا! آج مجھے بہت نیند آرہی ہے۔“
اسے حمیر کے لہجے میں کچھ غیر معمولی پن محسوس ہوا۔
”حوی! کیا ہوا ہے؟ تم مجھے تو بتاؤ۔ اگر کسی وجہ سے پریشان ہو تو پلیز مجھ سے شیئر کرو۔“ وہ اس کی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اپنے طرف کرتے ہوئے بہت محبت سے بولی۔

”میں کہہ تو رہا ہوں کچھ نہیں ہوا، بلا وجہ لٹھ لے کر ایک ہی بات کے پیچھے مت پڑ جایا کرو۔“ جھڑک دینے والے انداز میں اس سے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ کو بھی اپنے چہرے پر سے ہٹا دیا، پھر تکیہ پر سر رکھ کر لیٹتے ہوئے تنہی لہجے میں اس سے بولا۔

”اب میں سونا چاہتا ہوں۔ پلیز مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔“ اس نے کروٹ بدل لی۔

صبح وہ اپنے نارمل موڈ میں اس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اپنے رات کے رویے پر نہ اس نے ماہا سے سوری کہا اور نہ اس نے اسے کچھ جتایا۔

دیر سے سو کر اٹھنے اور چھٹی والے دن کا خوب شاندار اہتمام والا ناشتہ کرنے کے بعد وہ اپنے چھٹی والے دن کے مخصوص کاموں میں مصروف ہو گئی۔

ایک طرف واشنگ مشین لگی ہوئی تھی، دوسری طرف کچن میں سارے چولہوں پر کچھ نہ کچھ چڑھا ہوا تھا اور تیسرا کام ہاتھ کے ہاتھ اس نے حمیر کے جوتوں کی پالش کرنے کا شروع کیا ہوا تھا۔ چھٹی والے دن فرصت سے یہ کام کر لو تو روز بس ایک ہلکا سا برش پھیرنا ہی کافی ہو جایا کرتا تھا۔

وہ ہاتھ روم میں کھڑا شیو بنا رہا تھا اور ہاتھ روم کا دروازہ چونکہ کھلا تھا اس لیے اس سے باتیں بھی کر رہا تھا۔ گاہے گاہے اس پر نگاہ ڈال کر اسے یہ کہہ کر چھیڑ بھی رہا تھا کہ وہ اگر چاہتی تو بہت اچھی جوتے پالش کرنے والی بھی بن سکتی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھے حمیر کے موبائل کی بپ بجی تھی۔

”ماہا! دیکھنا کون ہے۔ اگر کوئی خاص فون ہو تو میری بات کرو ادینا، ورنہ میسج لے لینا۔“
وہ سر اثبات میں ہلاتے ہوئے اٹھی اور بیڈ کے پاس آکر موبائل اٹھایا۔

”ہیلو!“
”مجھے حمیر رضا سے بات کرنی ہے۔“ اپنے ہیلو کے جواب میں اس نے ایک خوبصورت زنانہ آواز سنی۔
”آپ کون بول رہی ہیں؟“

”سیدرہ آفاق۔“ وہ اس نام کی کسی خاتون کو جانتی نہیں تھی، اس لیے ایک پل کو فون کے خاص یا عام ہونے کے بارے میں سوچا پھر کچھ سوچ کر حمیر کے پاس آگئی۔

”کس کا ہے؟“ حمیر نے بے آواز پوچھا۔

”کوئی سدرہ آفاق ہیں۔“ اس نے بھی آہستہ ہی سے جواب دیا۔ حمیر نے اس کے ہاتھ سے موبائل لے لیا تو وہ ہاتھ روم سے باہر آگئی اور دوبارہ اپنے کمرے میں منہمک ہو گئی۔ حمیر کی گفتگو کی نہ اسے آواز آرہی تھی اور نہ اس نے قصداً سننے کی کوئی کوشش کی تھی۔
”یہ سدرہ آفاق کون ہے؟ پہلے کبھی نام نہیں سنا۔“

اس کا؟“ حمیر دوپہر میں اسی وقت شیو کرنے اور نہا کے فوراً بعد اس سے کسی ضروری کام کا کہہ کر گھر سے چلا گیا تھا اور پھر اب رات کے کھانے سے پہلے

پہلے اس کی واپسی ہوئی تھی۔

کھانا کھانے کے دوران وہ یونہی عام سے لمبے میں حمیر سے اس فون والی لڑکی کے متعلق پوچھ بیٹھی، بغیر کسی خاص تجسس کے۔

”کوئیگ ہے میری، مہینہ بھر پہلے جوائن کیا ہے۔ ہاورڈ سے ماسٹرز کر کے آئی ہے۔ ہو گئی نسلی؟“ وہ چاولوں کی ڈش زور سے پیچ کر غصے سے بولا۔

”حومی!“ اس نے حیرت سے اس کے غصے سے بھرے چہرے کو دیکھا۔

”کیا یہ ضروری ہے کہ میں اپنے ہر جاننے والے کی تفصیلات تمہاری خدمت میں پیش کیا کروں؟“ اسے پتا نہیں کیوں اتنا غصہ آگیا تھا۔ اس نے اپنے سامنے رکھی پلیٹ بھی غصے سے دور ہٹا دی تھی۔

”حومی! کیا ہو گیا ہے، میں نے ایسا تو کچھ بھی نہیں کہا۔ تم خفا کیوں ہو رہے ہو؟“

”دماغ خراب ہو گیا ہے میرا، یا گل ہو گیا ہوں۔“ وہ کھانا چھوڑ کر میز پر سے اٹھا اور پھر کرسی کو تھوکر مارتے ہوئے دروازہ کھول کر بالکونی میں چلا گیا۔

”تمہیں میری کیا بات بری لگی ہے حومی! میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا۔ تم اتنی سی بات پر ناراض ہو رہے ہو۔ میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی جو۔“ وہ اس کے پیچھے بالکونی میں آگئی۔ حیران پریشان سی۔

”تم نے کچھ نہیں کہا مگر تمہیں بلا وجہ میرے سر پر سوار رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔ میں کہاں جاتا ہوں، کس سے ملتا ہوں، کس سے بات کرتا ہوں۔ جب تک تم یہ سب پوچھ نہ لو، تمہیں اطمینان نہیں ہوتا۔“

وہ پتا نہیں کیوں ایک معمولی اور بلا وجہ کی بات کو ایشو بنا کر جھگڑا کرنا چاہ رہا تھا، لیکن اس نے بغیر کسی غلطی کے معافی مانگ لی اور پھر اس نے اسے مناکر ہی ویم لیا۔ اسے مناکر وہ واپس کھانے کی میز پر لے آئی تھی۔

مگر یہ صرف اس ایک روز کا قصہ نہیں تھا، وہ نجانے کیوں بات بے بات اس سے الجھنے لگا تھا۔ اس کے

خلاف مزاج تو ماہانے کبھی کبھی نہیں کیا تھا، اب تو وہ مزہ احتیاط برتنے لگی تھی مگر وہ پھر بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرنے لگا تھا۔ وہ اس کے ان الجھے رویوں کا سبب نہیں جانتی تھی مگر یہ الجھے رویے اسے پریشان بہت کر رہے تھے۔ اگلے پندرہ بیس روز تک حمیر کا مزاج یونہی چڑچڑا اور بد مزاجی سے بھرپور رہا۔ پھر خود بخود ہی اس کے مزاج میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ وہ اس کے ساتھ نارمل طرح جی ہو کر رہنے لگا۔ اس نارمل انداز میں بھی کچھ نہ کچھ اپنا رمل تو ضرور تھا۔ کچھ ایسے جیسے وہ صرف محسوس کرتی تھی، کوئی نام نہیں دے سکتی تھی۔ وہ صرف اس کے قدموں کی آہٹ سے مڑ کر دیکھے بغیر اس کا آنا محسوس کر سکتی تھی تو اس کی آنکھوں میں جھانکتی بیزاری کیوں نہیں بڑھ سکتی تھی۔ وہ بازو اب بھی ہر رات اس کے گرد حلقہ کیے ہوتے تھے، مگر ان میں محبت کی گرمی نہیں بلکہ برف کی سی ٹھنڈک ہوتی تھی۔

بظاہر دیکھنے میں ایسا کچھ تھا ہی نہیں جو غلط لگتا مگر کادل خوش نہیں تھا۔ اداسی کی یہ کیفیت پچھلے کئی دنوں سے اس کے ساتھ تھی۔ وہ جس راستے سے، جس طرف سے اس کے دل میں چھپی سوچوں کو جاننے کے لیے اس کے قریب جانے کی کوشش کرتی، وہ وہیں ایک ان دیکھی دیوار کھڑی کر دیتا۔ بظاہر ہنستا، مسکراتا جیسے سب کچھ سو فیصد ٹھیک ہے۔



چھٹی کا دن تھا اور حمیر اخبار اپنے سامنے پھیلا۔ بیٹھا تھا۔ سامنے ٹی وی بھی چل رہا تھا مگر جتنی دفعہ بھی وہ کمرے میں گئی، اس نے یہی دیکھا کہ وہ نہ اخبار پڑھ رہا ہے، نہ ٹی وی دیکھ رہا ہے اور نہ ہی اسے اس آنے اور جانے کی کوئی خبر ہے۔ اس نے کمرے میں ویکيوم کلیئر چلایا، ڈسٹنگ کی اور وہ اس کی آمد سے نیاز انی کسی سوچ میں الجھا رہا۔ وہ کسی بہت گہری سوچ میں گم تھا۔ جو کام ہو گئے تھے، سو ہو گئے تھے اور جو گئے تھے، انہیں ادھورا ہی چھوڑ کر وہ کمرے میں آئی۔

رسانیت سے بولا۔

”حوی! کیا بات ہے؟“ اس کے چہرے کی سنجیدگی اس کا دل دہلا رہی تھی۔ تیز تیز دھڑکتا اپنا دل اسے خود اپنے قابو سے باہر جاتا محسوس ہو رہا تھا۔

”میں شادی کر رہا ہوں ماہا!“ اس نے حمیرا کو یوں دیکھا جیسے وہ کسی ایسی زبان میں بات کر رہا تھا جسے وہ سمجھ نہیں سکتی تھی۔

”ماہا! میں شادی کر رہا ہوں سدرہ آفاق کے ساتھ۔“ اس نے اپنی بات دہرائی۔

اس نے اس بار بھی کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا اور گم صم سے انداز میں اسے دیکھتی رہی تو وہ مزید بولا۔

”میں اس اتوار کو سدرہ کے ساتھ شادی کر رہا ہوں

ماہا! تم سن رہی ہو میری بات؟“ اس کی سکتے کی سی کیفیت اور بے تاثر آنکھوں کو دیکھ کر اس نے ذرا زور سے ایک بار پھر وہی بات دہرائی اور وہ کوئی رد عمل کیسے ظاہر کرتی جبکہ اس کی کوئی بات وہ سمجھ ہی نہ پا رہی تھی۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ)

”کیا بات ہے تم چپ کیوں ہو کوئی پریشانی ہے؟“

اس کے ان سوالوں پر وہ خفا ہوتا تھا اس لیے اس نے ان میں سے کوئی بھی بات نہیں کی۔ وہ بس کسی بھی طرح ان کے بیچ حائل ہوتی اس ان دیکھی دیوار کو گرا دینا چاہتی تھی۔

”تمہارے بال کیسے روکھے روکھے سے ہو رہے ہیں حوی! اتنے خشک اور بے جان سے۔ چلو میں تمہارے سر میں تیل کی مالش کروں۔“ اس کے سر کو سلاتے ہوئے کہا۔ حمیرا خاموش بیٹھا رہا اس نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل سے تیل کی شیشی اٹھا کر لے آئی اور بیڈ پر اس کے پیچھے بیٹھ کر اس کے سر میں تیل ڈالنے لگی۔

”اب فوراً جا کر شیمپو مت کر لینا کہ“ مجھ سے تیل کی بوبرداشت نہیں ہو رہی تھی۔ دو گھنٹے تک تیل لگا رہنے دینا سر میں۔“

”ماہا! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“ وہ آہستہ آواز میں بڑی سنجیدگی سے بولا۔

”ہاں بولو نا حوی!“

”پہلے تم اپنا کام کر لو۔“ اس نے اپنے سامنے پھیلے سارے اخبار سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیے اور ریموٹ سے ٹی وی بھی آف کر دیا۔ اب کمرے میں سوائے خاموشی کے کچھ نہیں تھا۔ تیل کی مالش کرتے اس کے ہاتھوں کی رفتار سست پڑنے لگی، ان میں خود بخود ہی کپکپاہٹ بھی پیدا ہو گئی۔ وہ اتنی سنجیدگی سے اس سے کیا کہنے والا تھا۔ تیل لگوانے والا یہ کام اس نے کبھی ماہا سے خاموشی سے نہیں کروایا تھا، آج اتنی خاموشی سے بغیر کسی بحث کے کروا رہا تھا۔ اس کے بالوں میں گردش کرتی اس کی انگلیاں ٹھہر گئی تھیں۔ اس نے تیل کی شیشی واپس بند کی اور اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔ وہ پوری توجہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”ماہا! جو بات میں تم سے کہنے والا ہوں مجھے پتا ہے اس سے تم بہت ہرٹ ہو گی، تمہیں بہت دکھ ہو گا مگر میں کیا کروں، میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں۔“ وہ اس کے تیل لگے ہاتھوں ہی کو اپنے ہاتھوں میں لے کر

ہے۔ اہل ایمں۔ محبت سے زیادہ کر میرے لیے زندگی میں اور
 بہت کم ہے۔ یہ فیصلہ کوئی آسان فیصلہ نہیں تھا۔ بہت
 دھکے کے ساتھ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ مجھے تمہاری فکر
 فکری، تمہارا خیال تھا پورے دو مہینے میں اس الجھن میں
 جتنا رہا کہ کیا کروں۔ میں اپنے خوابوں کی قربانی سے فقط
 محبت کے سارے زندگی میں گزار سکتا۔ میرے سب
 خوابوں کی تعبیریں مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر ہیں اور
 میں انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہ واقعی بہت مشکل
 جس نرمی و انہایت سے بات کر رہا تھا ابھی بھی اس کا جذبہ
 دیرسای تھا۔
 اپنے سینے پر سر رکھ کر دلی اس لڑکی کو اس نے وحلیل
 کر دیا نہیں بتایا تھا ہاں مگر عیث کی طرف اپنے بازوؤں کے
 ملنے میں بھی نہیں لیا تھا اس کے دونوں ہاتھ ان یصلوں کو
 پکڑے ہوئے تھے جنہیں وہ ہاتھ کے قریب آنے سے پہلے
 بیڑی والا چاہتا تھا۔
 ڈھالی سال کا ساتھ تھا اتفاق تو رکھتی تھی وہ لڑکی کہ
 اسے دھتکارا اپنی عزت کے ساتھ جانتے۔
 ہم ایک دوسرے کے ساتھ اتنے خوش ہیں تو یہی ہر
 طرف سے آئیڈیل زندگی، آئیڈیل گھر، ہم میں تو بھی کوئی
 لڑائی جھگڑا بھی نہیں ہوا۔ وہ ابھی تک بھی بے یقینی سے
 یقین کی طرف نہیں آتی تھی۔
 میں خوش نہیں تھا مایہ زندگی بھی میرا خواب
 نہیں رہی مگر دن کر بیٹے فرخ کرنا اور میتوں کی بچت کے
 بعد اپنی مرضی کی کوئی چیز لے سکتا۔
 وہ ہے اور؟ ہیں کہ وہی تھی اور وہ تھا اور تھی وہ
 اس کے پاس کھڑے ہوئے ہی اسے اپنے ماضی کا قصہ قرار
 دے رہا تھا۔ جس شخص کی محبت میں اس نے اپنی ہستی بنا
 دی تھی، اسے خوش رکھنے کے لیے اپنے وجود کو فراموش کر
 چکی تھی اور وہ کہہ رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ خوش نہیں۔
 جس عورت کا شوہر یہ کہہ دے کہ وہ اس کے ساتھ خوش
 نہیں اس سے بڑھ کر ہرادی ہوئی عورت اور کون ہوگی۔
 اس نے میرے سینے پر رکھا اپنا سر اور اٹھایا اور آہستہ
 برساتی آنکھوں سے بے یقینی کے ساتھ اس کی طرف
 دیکھا۔ جو اس کی زبان نے کہا تھا وہی اس کی آنکھوں میں
 بھی لکھا تھا۔
 وہ آہستہ آہستہ اس کے پاس سے دور ہوتی تو وہ پر سکون

ہے؟ وہ ایک بار پھر زور زور سے رونے لگی۔
 ہم اپنی محبت کے پاس چل جانا۔ وہ تمہاری ماں ہیں۔ جتنا
 تم انہیں سمجھتی ہو وہ انہی ہوں گی نہیں۔ پھر تم اپنا
 ہو گونہ سارے گھر جو بہن کر رہی ہو۔ تنہا سارا
 جو معاملہ تھا۔ واقعی اسے خیال ہی نہیں آیا کہ وہ
 اس ماں کے گھر جا سکتی ہے جو بطور مہمان اپنے گھر
 اسے ایک کپ جاتے تھے۔ میں جانتی تھی۔ وہ اسے نظر
 کر کے اپنی بیٹک میں مصروف رہا۔ اب وہ اس کے
 باقی کورسٹ پر گھٹنوں پر سر رکھے بے آواز آہوں سے
 کہتی۔ بکھر کر اسے جن سے شامی کہا ہوں کے تھے
 کی خوشبو تھی۔ اس کے کچھ دیر بعد جاکے کی خوشبو۔
 میں نے کہا کہ فرانی کیسے ہیں اگر تمہیں لکھا ہے تو
 اب اور بڑھ چکی ہیں یہی دے رہے ہیں اور کینسل میں جاتے
 ہیں۔
 وہ جاتے کا کپ ہاتھ میں لے کر کمرے میں واپس آیا
 اسے مخاطب کر کے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر
 آن کر لیا۔ وہ کورسٹ پر ابھی بھی اسی جگہ اسی انداز میں
 کہتی تھی اس کی آنکھوں سے ابھی بھی قطرہ قطرہ کر کے لو
 رہا تھا۔ خوش نہیں میں ڈیڈاں بھی حقیقتوں کو جان
 سکتا تھا۔
 مولود۔ صبر کے موبائل پر کل آئی تھی اور وہ ایک
 میں جاتے کا کپ اور دوسرے میں موبائل لے کر
 اس سے نکل گیا تھا۔ اس کی آواز وہاں آسانی سے سنائی
 دیتی تھی۔
 میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم یہیں ہو؟ اس کا جذبہ بہت
 ہی اور آواز خوشی سے بھر پور تھی۔
 نہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ تم میری فکر مت کرو۔
 کورسٹ وری سدرہ میں کوئی چھوٹا سا بچہ ہوں جس کے
 کمرے میں کچھ چیزیں آؤ گی۔ میں کیا وہ بچہ بیٹے تک آفس
 میں گا۔ ہاں میں پھر کل دوسری میں تم سے ملاقات ہو
 گے۔ ٹھیک کیڑا ہے۔
 کیا کیا جاؤ تھا اس لڑکی میں؟ ڈھائی سالوں کی اس کی
 عمر تھی رفاقت کو اس نے محض دو ماہ میں خاک کر ڈالا۔
 لا جوڑا اس کا آشیانہ کس آسانی سے اس نے اجاڑ
 دیا تھا۔
 تمہیں تو اور بہت سے مل سکتے ہیں۔ اتنے بڑے باپ

کی بیٹی ہو۔ جسے چاہے، خرید لو۔ مگر میری زندگی میں تو فقط
 یہی ایک شخص ہے۔ اسے مجھ سے مت چھینو۔ یہ مجھ سے
 چھین گیا تو میں کس طرح کی پاؤں کی؟ اس کے بیٹی میں اتنی
 کہ وہ ابھی اور اس وقت جا کر اس لڑکی سے ملے۔ اس کے
 سامنے ہاتھ جوڑنے پر اس تو ہاتھ جوڑے۔ اس کے پاؤں
 پکڑنے پر اس تو پاؤں پکڑے۔ اس کی منت کرتے۔
 وہ کمرے میں واپس آیا۔ موبائل میز پر رکھا پھر ایک
 نظر اس پر ڈالی اور سونے کے لیے بیڈ پر لیٹ گیا۔ وہ
 کارپینٹ پر بیٹھی رہی اور وہ بیڈ پر لیٹا رہا۔ جس شب کو اس کا
 دل چاہا رہا تھا وہ ہاتھ پکڑ کر روک لے۔ وہ واقعی تیزی سے
 گزر رہی تھی کہ سویرا ہونے میں کچھ وقت رہی نہیں گیا
 تھا۔ وہ کچھ دیر سونا چاہتی تھی سو کر اٹھے کی قوس پکڑنے
 جیسے ہاتھ کا یہ ڈراؤنا خواب سو کر اٹھنے پر اپنی موت آپ مر
 جائے گا مگر غیہ آنکھوں میں آنے کا ہم نہیں لے رہی

سنجیو کو کتاب کھانا خزانہ کا مالک
 کے بعد لڈیکھا نوں کی کہیں
انڈین کھانے
 سنجیو کپور
 قیمت: 250/- روپے
 ڈاک خرچ: 30/- روپے
 آج ہی گھر بیٹھے منگوانے کے لئے
 280/- روپے کا منی آرڈر ریڈارٹ
 ارسال کریں۔
 منگوانے کا پتہ
 مکبہ عمران ڈائجسٹ
 37 - اردو بازار - کراچی
 فون: 2216361

نہیں ہوئی۔ "اس نے اس کی قمیض پھینک دی۔
 بھارت کے سے انداز میں اس سے جھگڑا۔
 ایک جھگڑے سے ان کی قمیض اس کی گرفت میں آئی۔
 انسانی خنٹ لہجے میں اسے وارننگ دی۔
 "تم نے اگر یہ ڈرامہ بند نہ کیا اور مزید ایک تین
 گھنٹے پہنچے تو میں توپیں تمہارا بالکل لٹا دیتی ہوں۔
 وہ ڈر کر ہنس کر "ٹھیک کر" خوف زدہ ہو گیا۔
 دیکھتی رہی اور وہ اپنے بیک دروازے کے اندر رستہ
 لٹک کی طرف چلا گیا۔
 اس کا ذہن پھر سے خوف ہونے لگا۔
 مجھ ہونے لگے "اس بات پر پھر سے ریل۔
 دوش و خروش سے پچھلے کی باطل عورت کی طرح
 اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر بند کیا اور وہیں
 کے پاس ہی کھڑی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے اس جگہ
 کھنے کو چکے تھے۔ اب اس کے کھر کی خاموشی کا
 نے توڑا۔
 "ماقی ہو میرے سبب سب سے تھک چکا ہوں۔
 پچھلے جگہ کی یادیں آج صبح کے ساتھ۔ ڈر کر رہا ہوں۔
 خوشی کی آواز میں۔ "اس نے اپنے کالوں کے
 مافوس کو آواز کی آواز میں وہ وہ ان وارڈ کالوں کی طرح
 ہلائی۔ اتنا اذیتنا کہ سانسے بھی بند ہو گئے۔
 نہیں آتی بہت بڑی طرح وہ کھڑا کر مٹنے لگی۔
 گری اس کی ناک اور ہونٹ پر چوٹ لگی تھی۔
 حلق کا احساس بھی ہوا تھا مگر وہ اس چوٹ
 دے بغیر فون کی طرف لپکی اور بچھڑ کر رہ گیا۔
 لگایا۔
 "نہی۔" یہ نام پڑتا ہے ہی تمہیں پھر۔
 بھرتے گی قمیض۔
 "میں بول رہی ہوں ماما۔" وہ کی آواز تھی۔
 "تمہیں کیا میرے فون کا انتظار تھا؟"
 "تمہیں کوئی سی میں سمجھی شاید اس کا فون۔
 آواز دیا پر قابو پا کر وہ بار بار انداز میں بات
 کو شش کرنے لگی۔ کسی کو کچھ بتا نہیں چکا ہے۔
 بھی اسی کو بھی۔
 "بہت دنوں سے تمہارا فون نہیں آیا۔ اس نے
 سوچا تمہاری قیمت پر چھوٹوں۔ تمہارے فون
 جاؤ تو ان ہاں آتی نہیں ہو۔ کسی طبیعت ہے۔
 "نہی۔" وہ کی آواز تھی۔
 "اس نے اس کی قمیض پھینک دی۔
 بھارت کے سے انداز میں اس سے جھگڑا۔
 ایک جھگڑے سے ان کی قمیض اس کی گرفت میں آئی۔
 انسانی خنٹ لہجے میں اسے وارننگ دی۔
 "تم نے اگر یہ ڈرامہ بند نہ کیا اور مزید ایک تین
 گھنٹے پہنچے تو میں توپیں تمہارا بالکل لٹا دیتی ہوں۔
 وہ ڈر کر ہنس کر "ٹھیک کر" خوف زدہ ہو گیا۔
 دیکھتی رہی اور وہ اپنے بیک دروازے کے اندر رستہ
 لٹک کی طرف چلا گیا۔
 اس کا ذہن پھر سے خوف ہونے لگا۔
 مجھ ہونے لگے "اس بات پر پھر سے ریل۔
 دوش و خروش سے پچھلے کی باطل عورت کی طرح
 اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر بند کیا اور وہیں
 کے پاس ہی کھڑی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے اس جگہ
 کھنے کو چکے تھے۔ اب اس کے کھر کی خاموشی کا
 نے توڑا۔
 "ماقی ہو میرے سبب سب سے تھک چکا ہوں۔
 پچھلے جگہ کی یادیں آج صبح کے ساتھ۔ ڈر کر رہا ہوں۔
 خوشی کی آواز میں۔ "اس نے اپنے کالوں کے
 مافوس کو آواز کی آواز میں وہ وہ ان وارڈ کالوں کی طرح
 ہلائی۔ اتنا اذیتنا کہ سانسے بھی بند ہو گئے۔
 نہیں آتی بہت بڑی طرح وہ کھڑا کر مٹنے لگی۔
 گری اس کی ناک اور ہونٹ پر چوٹ لگی تھی۔
 حلق کا احساس بھی ہوا تھا مگر وہ اس چوٹ
 دے بغیر فون کی طرف لپکی اور بچھڑ کر رہ گیا۔
 لگایا۔
 "نہی۔" یہ نام پڑتا ہے ہی تمہیں پھر۔
 بھرتے گی قمیض۔
 "میں بول رہی ہوں ماما۔" وہ کی آواز تھی۔
 "تمہیں کیا میرے فون کا انتظار تھا؟"
 "تمہیں کوئی سی میں سمجھی شاید اس کا فون۔
 آواز دیا پر قابو پا کر وہ بار بار انداز میں بات
 کو شش کرنے لگی۔ کسی کو کچھ بتا نہیں چکا ہے۔
 بھی اسی کو بھی۔
 "بہت دنوں سے تمہارا فون نہیں آیا۔ اس نے
 سوچا تمہاری قیمت پر چھوٹوں۔ تمہارے فون
 جاؤ تو ان ہاں آتی نہیں ہو۔ کسی طبیعت ہے۔
 "نہی۔" وہ کی آواز تھی۔

"میری طبیعت ٹھیک ہے ماما۔" وہ کی آواز تھی۔
 کچھ کام تھا۔ اس نے چھٹی کر لی۔ آپ کسی ہیں؟ اور انکل
 اور عبداللہ کیسے ہیں؟
 "میں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میرا گھر اجڑ گیا۔ کسی ماں
 کو نہیں میرے دکھ کیوں بتا سکتی ہیں؟
 "ابا میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مگر بھی ٹھیک ہیں۔ وہ
 میں نے تم سے عبداللہ کی باب کے لیے بات کی تھی۔
 کریم چھوٹ کر کابو کیا اس کا پھر اب اس کے کپڑے کر کے
 ماما اسے سارے کوڑے کر رہے ہیں۔ یہی وہی جگہ تم نے
 اس کے لیے اسے نہیں میں۔
 "نہی ماما کو شش کر رہی ہوں۔ ابا عبداللہ کچھ نہ کچھ
 ضرور ہو جائے گا۔" اس نے بالکل بھی بولا نہیں جا رہا تھا۔
 اپنی مشکلوں سے اپنی تمام تر باتیں کر کے وہ لفظوں
 کو ادا کر رہی تھی۔ دیکھ کر لپک رہا کہ اس نے اپنے
 ہوشوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی آنکھیں خون آلود ہو گئی
 تھیں۔ اس کے دھڑکنے والے ریتا اور آنکھوں
 سے آنسو۔ خون صاف کرنے کے لیے نشہ پی رہے تھے وہ
 انکل ٹھیک کیس آتی۔ وہاں بہت سے بھوتے برتن
 رکھے تھے۔ ایک بیٹ میں اچال کر گئے کتاب اور اس
 کے قریب ہی وہی روٹی چائے کے خالی کپ۔ وہ نشہ پی رہے
 بھول چکی تھی۔ وہ اب آہستہ آہستہ ان برتنوں کو پتھر مری
 تھی۔
 وہ اپنے اپارٹمنٹ کے ایک ایک کونے میں ہاتھوں کی
 طرح روٹی ہوئی پر مری تھی۔ نہ زینت نہیں تھی نہ آستان
 میرا کرا تھا۔ کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اتنا کہ ایک گھر
 ایک رشتے اور ایک محبت کی محبت میں خود کو مٹا دینے والی وہ
 لپک بھرتے تھا۔ وہی تھی۔
 "تمہیں میرے بغیر فون چاہی ہے؟ میں تو نہیں سوچا
 تھا۔" وہ کی آواز تھی۔ وہی کی آواز تھی۔
 "تمہیں کیا میرے فون کا انتظار تھا؟"
 "تمہیں کوئی سی میں سمجھی شاید اس کا فون۔
 آواز دیا پر قابو پا کر وہ بار بار انداز میں بات
 کو شش کرنے لگی۔ کسی کو کچھ بتا نہیں چکا ہے۔
 بھی اسی کو بھی۔
 "بہت دنوں سے تمہارا فون نہیں آیا۔ اس نے
 سوچا تمہاری قیمت پر چھوٹوں۔ تمہارے فون
 جاؤ تو ان ہاں آتی نہیں ہو۔ کسی طبیعت ہے۔
 "نہی۔" وہ کی آواز تھی۔
 "اس نے اس کی قمیض پھینک دی۔
 بھارت کے سے انداز میں اس سے جھگڑا۔
 ایک جھگڑے سے ان کی قمیض اس کی گرفت میں آئی۔
 انسانی خنٹ لہجے میں اسے وارننگ دی۔
 "تم نے اگر یہ ڈرامہ بند نہ کیا اور مزید ایک تین
 گھنٹے پہنچے تو میں توپیں تمہارا بالکل لٹا دیتی ہوں۔
 وہ ڈر کر ہنس کر "ٹھیک کر" خوف زدہ ہو گیا۔
 دیکھتی رہی اور وہ اپنے بیک دروازے کے اندر رستہ
 لٹک کی طرف چلا گیا۔
 اس کا ذہن پھر سے خوف ہونے لگا۔
 مجھ ہونے لگے "اس بات پر پھر سے ریل۔
 دوش و خروش سے پچھلے کی باطل عورت کی طرح
 اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر بند کیا اور وہیں
 کے پاس ہی کھڑی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے اس جگہ
 کھنے کو چکے تھے۔ اب اس کے کھر کی خاموشی کا
 نے توڑا۔
 "ماقی ہو میرے سبب سب سے تھک چکا ہوں۔
 پچھلے جگہ کی یادیں آج صبح کے ساتھ۔ ڈر کر رہا ہوں۔
 خوشی کی آواز میں۔ "اس نے اپنے کالوں کے
 مافوس کو آواز کی آواز میں وہ وہ ان وارڈ کالوں کی طرح
 ہلائی۔ اتنا اذیتنا کہ سانسے بھی بند ہو گئے۔
 نہیں آتی بہت بڑی طرح وہ کھڑا کر مٹنے لگی۔
 گری اس کی ناک اور ہونٹ پر چوٹ لگی تھی۔
 حلق کا احساس بھی ہوا تھا مگر وہ اس چوٹ
 دے بغیر فون کی طرف لپکی اور بچھڑ کر رہ گیا۔
 لگایا۔
 "نہی۔" یہ نام پڑتا ہے ہی تمہیں پھر۔
 بھرتے گی قمیض۔
 "میں بول رہی ہوں ماما۔" وہ کی آواز تھی۔
 "تمہیں کیا میرے فون کا انتظار تھا؟"
 "تمہیں کوئی سی میں سمجھی شاید اس کا فون۔
 آواز دیا پر قابو پا کر وہ بار بار انداز میں بات
 کو شش کرنے لگی۔ کسی کو کچھ بتا نہیں چکا ہے۔
 بھی اسی کو بھی۔
 "بہت دنوں سے تمہارا فون نہیں آیا۔ اس نے
 سوچا تمہاری قیمت پر چھوٹوں۔ تمہارے فون
 جاؤ تو ان ہاں آتی نہیں ہو۔ کسی طبیعت ہے۔
 "نہی۔" وہ کی آواز تھی۔

ہنس کر بات کر رہا تھا۔ ایک موبوہی امی تھی شاید وہ
 اسے روک رہے تھے لیکن وہ اس سے بات نہیں کر سکتی تھی اور
 وہ رات آتی تھی وہ اپنے کمرے میں تھا جوت جوت کر
 روٹی۔ کبھی بہت زور زور سے جھگڑا کرتی تھی۔
 "مجھے بہت اچھا لگتا ہے کبھی ایک روز تم مجھ سے
 کو کے کتنی جلدی کیجیں میں کمرے کے پانی میں چلا
 ہا۔"
 بہت جلدی ہے۔ پچیس سال گزر گئے تھے۔ پچیس سال
 بعد تو تم پورے ہو جاؤ گی۔ اس رات جب وہ یہ باتیں میر
 سے کر رہی تھی۔ تب کاتب تھراپسٹ کی مدد کی جس قدر
 مسکرایا ہو گا۔ اس کی قسمت میں تو اس رات کے بعد
 پچیس سال رفاقت میں باقی نہیں رہی تھی اس شخص کی۔
 ساری رات دوتے رہنے کے بعد صبح کے قریب اس کی
 آنکھ کھلی تھی تو اس نے اپنے مخصوص وقت پر دوپہر گر جاگ
 گئی تھی۔
 "جی ابا۔" وہانی میں بولے ہوئے وہ ہنسنے لگی کر
 رگ تھی۔ کمرے سے سات دنوں کی طرح اسے دوپہر جاگ
 وہ کمرے میں تھا۔
 "تمہیں اپنی زندگی میں کوئی کی محسوس نہیں ہو رہی؟
 میری طرح تو تمہارا خیال رکھتا ہو گا۔ کمان میں نہیں قریب
 ہوں لا کر رہے ہو گا۔ رات میں کون تمہارے پاس ہے؟
 گلاس لا ہو گا۔" وہ ایک بار پھر زور دے کر بولنے لگی تھی۔
 دن دن گزر رہے تھے۔ اس نے اپنے اپارٹمنٹ سے باہر
 نکلے گاڑی انڈیا میں گئے تھے۔ میں دن ہو چکے تھے۔ میں
 دنوں سے وہ اپنے اپارٹمنٹ میں قید کسی مرنے کی سی
 زندگی ہی رہی تھی۔ اس کے آس سے اس کی فیر حاضری
 کے اس کے روزوں پر تھا۔
 اس نے اپنی کسی بھی ضرورت کا کمرہ کر فیس سے چھٹی
 کر لی تھی۔ اس نے بھی ان کی کسی تو کیا شخص ایک دن کی
 چھٹی بھی کسی نہیں کی تھی۔
 ان دنوں اس نے پوری محسوس کی سی حالت میں
 کمرے کے کمرے میں ان سے دور اور چھٹی کے بعد ہی
 بھی ختم ہونے کا احساس ہوا تو وہ جو کچھ فرج میں رکھا وہ
 اور خشک ۱۱۱۱ کی روز ہونے کے کہ ختم ہو چکے تھے وہ
 کتنے دنوں سے بغیر ۱۱۱۱ اور بغیر شکر کے چائے پی رہی
 تھی۔ وہ ابی زندہ ہے۔ اسے خود اپنے آپ کو یاد دلانا پڑا۔
 یہ اپارٹمنٹ اس کی قبر تھا۔ وہ اس میں ہی مر رہا۔ وہ

اس کی حرام کردیتیں۔ اسے عدالت کے
پہنچنے کے لئے اس کی ہڈیاں دیتیں، بدعائیں دیتیں، اپنا ہر
کچھ اس کے واسطے سے پانی پانی اس سے وصول
کریں۔" اس نے کلثوم کی بات کالی اور اس سے زیادہ
درشت کہنے میں بولی۔

"تم یہ سب کر سکتی ہو کلثوم! اس لیے کہ تمہاری زندگی
میں تمہارے شوہر کے علاوہ بھی بہت لوگ ہیں۔ تمہارے
پاس ایک پورا خاندان ہے جس میں ایک رشتے کی کمی
دوسرے رشتے پوری کر سکتے ہیں مگر میرے پاس وہی ایک
شخص ہے، میرا شوہر، میرا واحد رشتہ۔ کیا ہوا جو اسے مجھ
سے ایسی محبت کیس جیسی مجھے اس سے ہے۔ محبت کے نہ
ہونے سے ہمارا رشتہ ختم تو نہیں ہو گیا۔ جلد یا بدیر اسے
اپنی غلطی کا احساس ہو گا تو وہ واپس تمہارے گھر آئے گا۔"
"وہ واپس آئے گا تو تم صبح کا بھولا شام کو گھر آئے تو بھولا
نہیں کہتے کہ کرا سے پھرے سر آنکھوں پر بٹھا لو گی۔ اس
ایک سو برس صدی کی ایک مثالی بی ورتا عورت جو شوہر کی
محبت میں خوش خوشی ہی ہو جائے۔ لعنت ہے ماہا احمد علی
تمہارے اس بی ورتا سہ پر۔" کلثوم نے غصے اور
جھنجھلاہٹ کے ساتھ اسے گھورا۔

"اور فرض کرو وہ واپس نہیں آیا۔ نہ جلد نہ بدیر، اگر
اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا ہی نہیں پھر؟" کلثوم کا انداز
جرح کرنے والا تھا۔

"ایسا ہوا ہی نہیں سکتا۔ وہ واپس آئے گا وہ واپس آئے
گا کلثوم! میری محبت اتنی بے اثر تو نہیں ہو سکتی۔" اس کی
توازی بھرائی اور آنکھیں جھپکنا شروع ہو گئیں۔

"وہ اپنی زندگی میں سے مجھے نکال ہی نہیں سکتا۔ کتنا ہے
"ماہا! تمہاری وجہ سے میری زندگی میں تریب ہے۔ اگر تم
نہ ہو میں تو پتا نہیں میرا کیا بنتا۔" کھوئے کھوئے سے لہجے
میں وہ حال کا صیغہ استعمال کر کے یوں بول رہی تھی جیسے وہ
دو چار روز کے لیے کیس چلا گیا تھا اور آج کل میں بس
واپس آنے ہی والا تھا۔ اس دیوانی لڑکی کا یہ محبت اور یہ
نیچر کلثوم کی آنکھوں میں آنسو لے آیا تھا۔ اس نے بے
اختیار کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

"وہ تمہاری محبت کے لائق نہیں! ماہا! امت خوار کرو خود
کو یوں۔ جو تمہیں بغیر کسی خطا کے سچ رستے میں بھجوا گیا،
تمہیں بھلا گیا! اسے تم بھی بھول جاؤ۔"

"بھلا رات آتا آسمان نہیں ہوتا کلثوم! میں نے اس سے

محبت کی ہے۔ اپنے دل کی تمام تر شدتوں اور چٹائیوں کے
ساتھ۔ تمہیں اپنے دل کی بات بتاؤں کلثوم! جس سے وہ
واپس آئے گا کہ "ماہا! میں تمہارے پاس واپس آؤں۔" وہ
واقعی جھپکی ہر بات بھلا کر اس کے ساتھ اپنی زندگی اس
سے شروع کر دوں گی جہاں پر ہمارا ساتھ چھوٹا تھا۔" وہ اپنی
دوست کے گلے لگ کر بک بک کر رو پڑی تھی اور کلثوم
عدنان اس کی رشتہ برہو لے ہو لے ہاتھ پھیرنے کے
اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

"ماہا! تم آئی کے پاس کیوں نہیں جھکیں؟ ایک سینے
تیار رہ رہی ہو، کتنا برا خطہ مول لیا، انگلیں رہتی رہیں۔"
بہت دیر بعد جب وہ اپنے جذبات پر قابو کر پائی تو اس بات کی
طرف آگئی جو اس وقت اس کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔
جس کی وجہ سے اس نے کلثوم کو بلایا تھا جو اسے کبھی اپنی
ماں سے پہلے باپ اور بھائی بہن کے متعلق سچ نہیں بتا پاتا
اس کے متعلق سچ کیونکر بتا دیتی جس سے اسے واقعی محبت
تھی اور نہ وہ لوگوں کی نگاہوں سے گرتا ہوا بھی دیکھ نہیں
سکتی تھی۔ وہ مہی کے گھر کیوں نہیں گئی؟ اس بات کو
سمجھانے کے لیے وہ بہت پیچھے کی باتوں کی طرف نہیں
مکئی۔ صرف حال کا ایک رہ نامزد واقعہ سنا دیا جو محض آٹھ
روز پہلے پیش آیا تھا۔ ہفتے کی رات مہی، عبداللہ کے ساتھ
اس کے فلیٹ پر آگئی تھیں۔ وہ اسے عبداللہ کی جانب لی
پارہ پالی کروانے، اس کا سی دی اور ڈاکو منٹس دینے لگی
تھیں اور وہ غیر متوقع طور پر انہیں دیکھ کر یوں کھلا کھی گئی
رات کے ساتھ سے پارہ بچے حیمیر کی غیر موجودگی اور
ایار منٹ میں اپنے تنہا ہونے کا جو اڑپیش کرنے کے لیے
کسی جھوٹ کے بجائے بول کھلاہٹ میں اسے انہیں سچ
بڑا تھا اور سچ سننے ہی وہ گھبرا کر یوں کھڑی ہو گئی تھیں
انہیں کڑک لگ گیا ہوا۔ "ماہا! میں واپس ان کے پاس
آجائے۔" اس نے ان کی آنکھوں میں پھیلے اس خوف
بڑے آرام سے دیکھ لیا تھا۔ تب اس نے خود نہیں
کہ وہ اپنے ایار منٹ کو پھوڑ کر کہیں اور جائے گی
حیمیر کی فون کال کے بعد اسے پتا چل گیا تھا کہ اب
یہاں سے جانا ہے۔ وہ صبح کتنا تھا اس کی مہی اپنی غلام
نہیں بھلا وہ انہیں سمجھتی تھی۔ بس اتنا ہی تو تھا کہ ان
گھر میں اس کے لیے جگہ نہ تھی۔ اس میں حکم تو نہیں
نہیں تھا۔

کلثوم کی آنکھوں میں ایک بار پھر اس کے لیے جگہ نہ تھی

”تو تم اس کی زندگی حرام کر دیتیں۔ اسے عدالت کے کمرے میں بیٹھیں گھایاں دیتیں اور عاقل دیتیں اپنا ہر حق پیسے کے حوالے سے پانی پانی اس سے وصول بنا کر کمرے میں اس نے کلوم کی بات کئی اور اس سے زیادہ وہ سارے تھے جو تھے۔“ اس لیے کہ تمہاری زندگی تھا۔

باگل آنکھوں والی زندگی
اتنے مٹے خواب نہ دیکھو
نچھٹاؤ کی
سوچ کا سارا اجلاؤ گندن
شرابی کا دھم میں قتل جائے گا
پے پے رشتوں کی خوشبو کا ریشم
نکل جائے گا

تو کیا جانو؟
خواب سنو کہ صبح کے تیشے
خواب کو جو رو برات کا لہو
خواب خیالوں کا چھتہ دار
خوابوں کی منزل سوارو
خوابوں کا حاصل تھلاؤ
تو کیا جانو؟
مٹے خواب خرچہ ہوں تو
تکسین چننا پڑی ہیں
رشتے بھونڈے ہیں
اندیشوں کی ریت نہ چھانچو
پاس کی آہٹ سراپ نہ دیکھو
اتنے مٹے خواب نہ دیکھو
تھک جاؤ گی!

ہست مٹے خواب دیکھ بیٹھی تھی ماما احمد علی۔ آن اس کے دو سارے خواب نوٹ کر بھر رہے تھے۔
”دیکھیں اس پاکس میں ہست یعنی ہینٹنگز اور کرٹل کے گلدان رکھے ہیں اسے احتیاط سے رکھیے گا۔“
”اس پاکس میں ہست باز کر کر رہی ہے دیکھیے گا کہیں نوٹ نہ جائے۔“ وہ اپنی آنکھوں میں آنے آنکھوں کو بار بار پیچھے دھکیل کر سلمان اٹھاتے ہوئے مزوڑوں کو

محبت کی ہے۔ اپنے دل کی تمام تر شدتوں اور غم کو ساتھ۔ نہیں اپنے دل کی بات تھوڑے کلنگوں کو واپس آئے گا کہ ”ملا میں تمہارے پاس واپس آؤ۔“ واقعی جھلی ہر بات بھلا کر اس کے ساتھ اپنی اس سے شروع کر دیں گی۔ ہمیں ہمارا ساتھ چھوڑنا اس دوست کے گلے گلے کر دیکھ کر دیکھ کر دیکھ کر اس نے غم کے رز میں ہوسے ہوئے ہاتھ اس سے بات کہی ہوئی تھی کہ ان کی ضرورت کے لیے اسے فلوڑی بہت ہے۔ فرسٹ فلوڑی بے ایک کمرہ اور ایک باجن ان کی ضرورت سے ڈانٹ ہے۔ خلیل اس کمرے کو اگر وہ گراہ پر دے دیں تو جگہ آسٹریس ہوئے گلے کی اور کچھ پیسے بھی جاس کے۔ ان سے چوڑے گٹ ایک سی تھا اور فرسٹ فلوڑی پر جائے۔ یہ وہاں بھی گھر کے اندر رہی تھی سے ہی مانی تھیں اس لیے وہ کسی فرسٹ جان پچان والی پھونکی سی جلی کر رہی رہے۔

اس نے اس روز کلثوم سے دو کمرہ کر لیں پر لینے کی تھی۔ وہ کتنے کراہے کر رہا تھا چاہتے تھے اسے اس میں تھا۔ کلثوم کو سب کچھ بتا دینے کے بعد اس نے سے وعدہ کیا تھا کہ وہ یہ ساری چٹائی کسی اور کو نہیں دے گی۔ اپنے شوہر کو بھی نہیں۔ اسے اندیشہ تھا کہ وہ بھی نہیں۔ پھر ایک بھونکی ماما احمد علی کے پاس تیار تھی۔ اس کا شوہر مزید تعلیم حاصل کرنے امریکہ گیا ہوا ہے۔ اس کے پیچھے کھر میں وہ اکیلی تو نہیں رہ سکتی اور چونکہ اس شوہر خود دار اور حیرت مند ہے۔ اس لیے اسے اسے لیے عرصہ تک اپنی بیوی کا اس کے پیچھے میں رہنا کی صورت کو اور انہیں۔ سو ہی خودداری اور حیرت مندی ہے۔ سب وہ ان کے گھر بطور کمرہ دار رہنا چاہتی ہے۔ ہاں اس کے شوہر کی خودداری پر کوئی آج بھی نہیں آئے کی اور کسی انجان جگہ اور خیار رہے جیسی مشکلات کا شکار بھی نہیں ہوئی کہ کلثوم کی فیملی اس کی دیکھی بھائی ہے اور اس کے شوہر کو بھی ان پر پورا بھروسہ ہے۔

لارنسٹ سے سلمان شہت ہوتے وقت کلثوم اس کے ساتھ سارا وقت رہنا چاہتی تھی۔ اپنا بھٹکا ہوا سہارا بوجھ آ کر آ اور خالی ہو نا دیکھنا کسی عورت کے لیے سن نہیں ہوا تھا گھر شوہر نہ تھے وہ انہیں نظر انداز کر کے پرا دن اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی۔ ماما نے اسے

اپنے ہاتھ کے لیے کہا تھا۔
”کلیسٹ ہست وہ گھر خالی ہو آجائے گا جس میں وہ سہل اور زمینیں بے اس نے حیرت دہانے کے ساتھ ایک ہی زندگی کی راگرتے ہوئے قدم رکھا تھا۔ یہاں قدم قدم پر اس کے لب نکھٹ ہوئے تھے۔ آج اس کے خواب اس سے روٹ تھے۔ آج اس کا گھر اس سے بچھن رہا تھا۔ وہ گھر باریں اور وہ سارے خواب اسے رزق خاک کے حصار تھے۔ وہ خالی لارنسٹ میں اپنی کھڑی تھی۔ اس کی زندگی کا وہ جو تھا کہ اس سے بچھن گیا تھا جسے بچھن اور اعتماد کے ساتھ اس نے اپنا جان لیا تھا اور اپنا گلے کے بعد اسے بہت زیادہ سے دن رات محنت کر کے تھا۔ ایک کمرہ ایک دیکھ دیکھ بار بھری چھاؤں ان کے خواب بکھیتی ماما احمد علی ایک بار پھر بے کھر بولی

”اکیلے ہیں“ چاہے اس اکیلے پن میں ہمارا اپنا کوئی نہیں بچھری معاشرے کے مروجہ اصولوں کے تحت کسی دکاہوں میں اپنی عزت اور اپنا مجرم قائم رکھنے کے لیے نہیں اپنا اپنا چھانڈنا ہے۔ وہ بھی لوگوں سے اکیلے پن کو بچھانڈنے زندگی کو بچھنی کی کوشش کر رہی ہے۔ گھر واپس نہیں آئی اور انہیں کھانے کا نہیں اور کر رہی وہ انہوں نے بھی اس سے کئی کھانا اور نظر انداز ہو رہا۔ وگرت اس سے پہلے عبداللہ کی جانب سے لے سے کچھ پیسے کے لیے اس نے وہاں صرف لے لیا تو وہ اس کی آواز سننے پریشان ہو جاتی تھیں۔ وہ گھر پر آؤ نہیں ڈالنے والی اور یہ کہ اس نے عبداللہ کو کئی میں جانب بھی دلوادی ہے۔ ان دونوں باتوں کے بعد داخل تھک اس سے خالی ہزارہ فز میں بات کرنے کے عبداللہ کی جانب کا ہوا جانے کے بعد جب بھی ماما احمد اور اس کا شوہر مٹھائی اور کچھ تھے تھا تھک اس سے ملنے گھر پر آئے تو کلثوم کے گھر والوں کی میں اپنی عزت اور مجرم قائم رہنے کے احساس نے

بے حد اطمینان دلایا۔
”خدا ہے جو کہ اس کے اندر میں کام کر رہا تھا“ اس لیے ماما احمد اس کے ساتھ بہت اچھا رویہ اختیار رکھنے کا ”خوش“ وہ اس سے ملنے آتا تھا۔ اسے کہیں ہانا ہوتا

تو ساتھ لے جانے کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیتا اور وہ قصداً اسے انکار نہ کرتی۔ لوگوں کو یہ نظر آ رہا ہوتا ہے کہ اس پر یقین بھی کر لیتے ہیں۔ صبح سے شام تک آٹھیں اور آٹھیں کے بعد وہ ایک کمرہ اس کی زندگی ان دونوں اس طور گزور رہی تھی۔

کلثوم کی چھوٹی بہن غزل کی شادی کا سلسلہ تھا۔ آٹھ کی مصروفیات سے علاوہ اس کے پاس سب بھی وقت ہوتا وہ شادی کی تیاریوں میں ان لوگوں کے ساتھ شریک ہو جاتی ان آٹھ مہینوں میں آٹھ اور انکل نے اسے گھر کا فوری سمجھا تھا۔

غزل اور محبت اکثر وہاں سے نہیں ملتا جہاں سے ہمیں امید ہوتی ہے اور جہاں سے کبھی امید رہی نہ ہو۔ کبھی بھی وہاں سے مل کر انہیں کو بچھنی کی تھی اسے کہتا ہے۔ فائز کی یہ جلی بھری لاکھ تھا سو وہ اکثر یہاں آتا رہتا تھا اور ان لوگوں پر فائدہ شادی کی تیاریوں کا مرحلہ درجش تھا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ یہاں رہا تھا۔ آٹھ میں اب اس سے ملنا اس لیے نہیں ہوا تھا کہ اپنے پیکی کی ہاراضیوں اور خفگیوں پر کان دھرتے ہا فز اس نے ان کی بیٹی جو ان کر لی تھی۔ فائز کی یہ بات اسے ابھی گئی تھی کہ ایک امیر اور ہا فز رہا تھا شخص کا مٹا ہونے کے باوجود اس میں اپنی لادرت پر عود کے بجائے سادگی تھی۔

میکوڑی میں جب کلثوم کے نواسے سے وہ شراب شروع میں اس سے ملی تو اس کی کسی بات سے اسے یہ انداز نہ ہو سکا کہ وہ ایک بڑس ٹائیکون کا لڑا اور انکل تائینا ہے۔ تب کلثوم نے ایک ہار فائز کے پیکی کھنی اور ان کے اسٹیشن کے متعلق جا کر اسے حیران کر دیا تھا اور تب اس نے یہ سمجھا تھا کہ وہ ہار کا اس سے تعلق رکھنے والا ایک ایسا انسان ہے جسے اپنی دولت ”مائی مشیت اور اپنے مقام پر تھا۔“ کوئی خوراک اگر نہیں۔ کلثوم کا گھر ان ایک کھانا چڑھا خوشحال گھر ان کھانا جاسکا تھا مگر کچھ بھی ان کے اور فائز کے گھر اس کے اسٹیشن میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اسٹیشن کے اس فرق کے باوجود بھی وہ اپنی بھوپو کے گھر خوب آمد نہ صرف وہ بلکہ اس کے ماما اور چھوٹی بہن آہٹ بھی آٹھ انکل کے ہاں ہر خوشی کے موقع پر پوری خوشی کے ساتھ شرکت کے لیے موجود ہوا کرتے۔

پہچانتا ہو کہ دوستی کے معاملے میں اسے ملنا
شدید اختلاف رہا کرتا تھا۔ وہ انٹیمس دیکھتے ہیں
پونجیوں کو دوست بنائیں تھی۔

تب وہ اس بات کو سمجھتی نہیں تھی۔ اگر سمجھتی تھی
رضا کو فائز کے ذکر کے دوران یہ ضرورتاً کی فائز سے
برس ٹانگیوں کا اگلوٹا بیٹا ہے پھر وہ اس کے دوست
یقیناً فوراً "لٹنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ اس وقت اسے
ساتھ دیکھ کر ظاہر ہے۔ اس نے یہ اندازہ لگایا تھا۔ وہ اس
کا کوئی قریبی دوست ہے۔

"میرا مطلب ہے تمہاری شادی پر میں حیران
سے مل چکا ہوں۔" فائز نے مسکراتے ہوئے اسے
وضاحت کی۔ وہ ابھی بھی طنزیہ نگاہوں ہی سے
ہوئے حیران دیکھ رہا تھا۔

"ارے میں نے آپ دونوں کو اپنی دوست ماما
سے تو ملوایا نہیں۔" اس نے ماما حیران دیکھتے ہوئے
ایک لفظ بہت چبایا کر ادا کیا۔

"بہت چڑتی ہے۔ اگر بھی اسے اس کے شادی
پہلے والے نام ماما احمد علی سے بلاؤں۔" وہ حیران کا ناوا
اور کوفت اور سدرہ کی حیرت و اچھے کو انجوائے کرتے
ہوئے مسکرایا اور پھر گردن گھما کر دیکھا جہاں وہ
تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان دونوں نے بھی وہیں
تھا۔ وہ جگہ خالی تھی۔ ان کی باہم گفتگو کے دوران ہی وہ
وہاں سے نکل کر جا چکی تھی۔

"لو ماما تو چلی بھی گئی۔ چلو خیر کوئی بات نہیں ہے
آپ دونوں کو اس سے ملوؤں گا۔ بہت اچھی لڑکی۔

ایک ہی خرابی ہے اس میں۔ اسے لوگوں کی پہچان
سب کو اپنے جیسا تھا اور غلط سمجھتی ہے۔"
چرے سے اب بھی مسکراہٹ بھی مکمل
رخصت ہو چکی تھی۔ وہ اب واضح رہی اور غصے
کو دیکھ رہا تھا۔

جبکہ سدرہ سب سمجھ لینے کے بعد اس
صورت حال کو اپنے قابو میں کرنے اور فائز عید کی
چلتی منہ پھٹ زبان کو خاموش کرانے کی کوشش
تھی مگر فائز عید اس کی کوششوں سے نہیں اپنی مرہبی
خاموش ہوا تھا۔ اسے جو کہتا تھا وہ کہہ چکا تھا۔ اس
سدرہ سے خدا حافظ کہتے ہوئے اس نے حیران کی طرف
بڑھایا۔

تمام تاثرات باب وقت اس کے چہرے پر پھیلے تھے۔ اسے
یقیناً اس سے یہ فطرتاً ہی ہوا تھا کہ وہ اپنی عادت کے
مطابق رونے دھونا چا کر پھر اس کے پیروں میں گرنے کی
کوشش کرتے گی۔

"جی تو تم مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔ پلیز واپس
آجائو۔" جیسی کچھ انجائیں اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر
کرتے گی۔

حیران رضائی آنکھوں میں "کیس کوئی تماشہ ہو جائے"
کا خوف دیکھ کر اس کا دل ہی جھٹکا کہ وہ یہاں ایسی دکان میں
ایک سین گری ایٹ کہہ کر کیا لڑکی کہ ماما احمد علی تماشے
کر لینے والی لڑکی تھی نہیں۔ اگر واقعی ایسی ہوتی تو اس کے
منہ پر مسکراہٹ نہ ملنے لگتی مگر جس نے اس کی محبت
اس کے غلوں اس کی سادگی اور اس کی وفاؤں کا مذاق
اڑایا۔ کاش وہ کوئی تماشہ نہ لپاتی۔

"تم یہاں کھڑی ہو؟ اور وہاں بھاگتی اور غزل مجھ سے
آکر پوچھ رہی ہیں کہ ماما کہاں ہے۔" اس نے اپنے پیچھے
فائز کی آواز سنی۔ وہ اسے دیکھ کر دوڑے ہی بولتے ہوئے
اس کے قریب آگیا۔ اپنے چہرے کے تاثرات کو ہر ممکن
حد تک بائیل رکھنے کی کوشش کرتے وہ اس کی طرف
مڑی۔

"میں بس یہاں سے نکل ہی رہی تھی۔ چلو۔" فائز نے
اس کی بات پر توجہ نہیں دی تھی۔ اس کی نگاہیں سامنے
کھڑے اس خوب صورت سے جوڑے پر تھیں جو خوشی
سے سرشار اپنے پہلے پہلے کی شاپنگ کر کے ابھی فارغ
ہوئے ہی تھے۔

"ہائے فائز! سدرہ اتفاقاً نے وہیں سے مسکرا کر فائز کو
ہیلو کہا تو وہ فوراً ہی چند قدموں کا فاصلہ عبور کر کے ان
دونوں کے قریب پہنچ گیا۔

"ہیلو سدرہ! کیسی ہو؟"

"بالکل ٹھیک۔" پھر اسے حیران سے ملوانے لگی۔

"میرے ہسپنڈ حیران تھا۔"
"تمہیں تعارف کروانے کی ضرورت نہیں میں انہیں
بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔" فائز کے مسکراتے اور خوش
اخلاقی سے بھرپور لہجے میں چھپی طنزیہ کالت اتنی واضح تھی
کہ سدرہ اتفاقاً نے چونک کر اسے دیکھا جبکہ حیران جڑبڑ
ہوتے اپنی ناگواری کو ہنسی کو ہنسی خوش اخلاقی کے پردے میں
چھپایا۔ وہ فائز کو ماما کے دوست کی حیثیت سے شاید ہی

پاکستان میں گزارا ہے یہاں پر میڈیسن پڑھ لی تو اس کا یہ مطلب پڑا کہ میں کہ وہ اپنی ساری زندگی میں گزارا جاتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ میں شادی کے بعد اس کے ساتھ امریکہ میں سیدھل جاؤں اور وہیں کویتا ہے پارامیڈیٹلن اور اپنے کھواہن کو پتہ نہ ہو کہ اس اور ملک میں سیدھل ہونے کا بھی کچھ اور اسے نہیں تھا۔ چاہت ہے میری بہن جو امریکہ کی دیو نہ ہو۔ سو میں نے اس کے ساتھ امریکہ میں سیدھل ہونے سے انکار کر دیا۔ اس بات پر ہمارا کیمپ وہ زمانہ دور کا اور آج کی سی نہیں ہے۔ ان آج کی سی تھوڑی سی ٹی ٹی ٹی۔

”آج کی سی تھوڑی سی ٹی ٹی ٹی۔“ امریکہ غالی کر جانے گی۔ آج کی تو میں کسی الیہ ٹرم کے انچار سے بیرونی طرف سیدھل ساکنہ منتا اس انتظار میں ہوں کہ شاید وہ اسٹ موٹیشن آخری لمحوں میں اپنا فیصلہ بدلے اور ہمیں رک جائے۔“ بلکہ جیسٹ موبائل میں مسکراتے ہوئے فائز نے ایک ایسی بات ان سب کو پہنچائی کہ سن کر ہمارے ساتھ ساتھ اٹھ اٹھ اور فکرمیں ہی بکا رہا۔ وہ زارا علیہ سے ہے تھا صحبت کر تھا۔

اور اس کی محبت کا زین میں موجود کسی بھی فرو سے جنسی ہوئی نہیں تھی۔ سب ایسی شادی کی کیفیت میں تھے تھے کہ فارم ہاؤس تک پہنچنے تک سب بالکل خاموش اور کم سم سے ٹیپتے رہے۔ فائز اور زارا کی ایک دوسرے سے وابستہ محبت پھر اس محبت کے نتیجے میں دو دن عظیمیہ وہ جانے والی ان کی مٹتی ہوا تہ سے برس تک قائم رہنے کے بعد میں اس وقت ٹی ٹی ٹی جب ان کی شادی کی تیاریاں تکمیل کے آخری مراحل میں تھیں۔

”تم تو ایسے چپ ہو گئی ہو جیسے میں نے تمہیں کسی کے حرم کی خبر سنائی ہے۔“ وہ ہاں آئے کے بعد بھی بالکل خاموش تھی جبکہ بلی سب نے اپنے موڈز ٹھیک کر لیے تھے۔

”فائز! تم اسے روک کیوں نہیں رہے؟“ اسی ہی بات پر اچھا پوچھا۔“

وہ درشتوں کے سامنے میں ایک طرف تھا اور خاموش کھڑی تھی۔ فائز بھی اس کے پاس ہی چکر کھڑا ہو گیا تھا۔

”میں نہیں جانتا ہوں کہ اسے روک دے کے رک جائے ہیں یا نہیں؟“ اس کا سوال ان اڑا ہوا تھا جیسے کتنا جانتا ہو۔

”تم تو یہ بات مت کہو۔ تم ابھی طرح جانتی ہو کہ جانے

والے روکے سے دیکھتے تھے۔ کیا تم روک جاتی تھیں اسے؟ نہیں؟“ انہیں بھی میں روک رہا ہے۔“

”فائز! وہ کچھ بھری نگاہوں سے اپنے دوست کو دیکھ رہی تھی جس کی آنکھوں میں ہنسنے اور مسکراہٹ کے پتے بھی اسے صاف دکھ رہا تھا۔

”اسے لگتا ہے مجھے اس سے بھی محبت تھی جی نہیں۔“ اگر میں اس سے محبت کرنا تو اتنی ہی بات کو اٹھاتا ہوں۔“ اس کے ساتھ جانے سے انکار نہ کیا۔ محبت میں شراہہ نہیں دیکھی جانتے یا انکار نہ کر سکتے۔ اگر میرے ساتھ چلوں تو تم سے شادی کروں گی ورنہ میں اس سے ملنے کے لئے تیار ہو جاؤں۔“ اس کی بے باقاعدہ بات نے صرف اس کی محبت کی خاطر اس کے ساتھ امریکہ سیدھل ہونے کے لئے تیار ہو جانے میں اسے ہلکا سا اثر دیا۔ وہیں امیرت طاہران کے اور بچے نہیں ان کا بڑا نہیں سیدھل سکتے۔ میرے ماما پاپا کو میری ضرورت ہے لوہ میں انہیں چھوڑ کر نہیں اور جاسوں؟ نہیں؟“ انہیں ماما پاپا نہیں کر سکتے۔ ماما نہ لیا کرتے ہیں وہ سیدھل کر لیں گے میں زارا کے ساتھ چلا جاؤں۔ شادی کے بعد امریکہ سیدھل ہونے ہمیں کوئی بات تھارے درمیان بھی نہیں ہوتی تھی اس نے اپنی یہ خواہش میرے سامنے رکھی اور میرے انکار پر اپنی اس خواہش کو اپنی شہر اور اپنی زندگی بھائی بھائیوں میں اس سے اس کی پہلی سے دور رہنے کو کہہ رہا ہوں۔“ اس کے والدین ہمیں کراچی شہر میں اور نہ ہی ہماری مٹکی ایسی کسی شہر کے ساتھ ہوتی تھی نہ یہ کہا جائے کہ میں اپنے دھرت سے محروم ہوں۔

اس نے مجھے کل تک کاہنم دیا ہے اگر میں جانے کی ہائی بھراؤں کو روک دے گا۔“ اس نے کہا۔ پھر ایک مہینے بعد شادی کر کے اور مزید پندرہ تیس روز کراچی میں قیام کر کے ہم دونوں ساتھ امریکہ چلے جائیں گے۔ اور اگر میں توکل وہ اپنی یہاں سے چلی جائے گی۔“ وہ اب بہت سمجھدی کی اسے ساری بات تھا رہا تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر سے مسکراہٹ کا روہ ہٹا دیا تھا اسے فائز کے چہرے پر دکھ اور کرب واضح دکھائی دے رہے تھے۔

”اس نے مجھے بتایا ہے کہ اسے مجھ سے پہلے بھی کافی شکایتیں تھیں کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اس لیے قصداً اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ اس کے کچھ پوچھنے پر اسے ساری بات بتانا چاہا تھا۔

”مجھے تمہیں یہ بات بتاتے اور ہی بھی افسوس میں نہیں ہوتی بلکہ میری عقیدہ میں شادی سے ایک مہینے پہلے مجھے پتہ چل گیا تھا۔“ اس نے کہا۔ اس نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ تمہارے لیے کوئی بھائی نہ تھا۔ اور اسے نہیں ملنے وال کو اٹھانے وال ایک نہیں ہے۔“

وہ اس کی اس کو کتنی اور کس غلطی کا احساس داتا تھا۔ رہا تھا وہ جانتی تھی اور بے سناہی ہی زامست سے اس کی شکایتیں تھیں۔ اس بات کے بعد پھر کالک کے دوران ان کی وقت بھی ازارا علیہ کا ذکر نہیں ہوا تھا۔ بچے کے بعد سب نے اسے گھنسنے کا راز اور پھول دے کر حیران کر دیا تھا۔ فائز نے فائز نے اپنی انگلی نے ہلکا ہلکا ہلکا سے فائز نے سب کے گھنسنے سے تیار رہے تھے کہ بڑی سوچ بچار اور غور فکر کے بعد خرید گئے ہیں کہ ان میں ہرچیز سونچنے میں اس کی ہندو کی تھی۔

اس لیے تھا شادی کا راز غلوں میں اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لے آیا تھا۔ وہ جانتی تھی اس کے دل کو زامست سے بھی وہ چکر کر رہا تھا۔ اسے نہیں اس کے گرد ہیں اور وہ پھر بھی بے شکریہ نہ کہلا رہی تھی۔ رات کی تھوڑی سی میں چینگے پانیے سوچ کر آنسو بہا لے کر اس کا کوئی کچھ نہیں۔ اس کا کوئی اپنا نہیں۔ اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ یہ سب لوگ یہ سب اس کے لیے ہی تھے۔ کوئی رشتہ نہ ہونے کو بھی اس ان سب کے ساتھ غلوں اور محبت کا رشتہ ہے۔

وقت کا کام کرنا ہے۔ مسوہ کزور رہا تھا۔ بڑی سیکر و قمار کی کے ساتھ پل ٹرینک۔ قمار کی سے گزرا۔ آج وقت ہے۔ مقتدا اور بے صرف نہیں کر رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے میں بہت سی کامیابیاں ہو کا کامیاب بھی اڑا کر رہا تھا۔

ایک لڑکی ہونے کی وجہ سے اسے بہت سی بھگتوں پر مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا۔ اگر اس کی ترقی پر خوش ہونے والے، بہت سے تو حسد کرنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔

وہ اب اپنی گاڑی رکھتی تھی اور اسے خود اڑا کر بھی کرتی تھی۔ ہاں گھر اس کا بھی کچھ ہی ایک کمرہ تھا۔ کسی اچھے سے فائز کے اچھے سے لار ٹمٹ میں رہتا وہ بڑی آسانی سے فورہ کر سکتی تھی مگر اس کی تھوڑی سی کی مرزاد

اس کی خوب صورتی یہ سب اسے ایسا کرنے نہیں دیتی تھی۔ فائز کے پہلے سے ایک کمرے کے گھر میں رہا۔ دار کی حیثیت سے رہتا تھا۔ اس کی پوسٹ کی مطابق نہیں تھا۔ اس کا ایک کمرے کے گھر میں وہ محفوظ تھی۔ ہاں ہر قدم قدم پر میرے لیے تھے اور وہ تھا۔ اس کا فائز نے اسے کوئی نہیں تھا۔ اسے خود اپنی عزت اور مہر کی حفاظت کرنی تھی۔

ہم قیام کی بنی کی شادی تھی۔ اپنے آپس کے ایک معمولی سے چڑائی کی بنی کی شادی میں جانے کی اس نے ہاں فرست تھی۔ یہی سیدھل انگریزوں کی لار ٹمٹ CEO کی بنی کی شادی ہوتی تو ساری مسکراتی چل رہی تھیں۔ وہ جانتی تھی۔

نئے سے نیا وہ سب کی شرکت ہاں صاحب کے لیے اہمیت رکھتی تھی۔ مگر وہ اپنی کو بیکار کر لینے کے لیے مجبور تو نہیں کر سکتی تھی۔ اپنی گاڑی کی موجودگی کے علاوہ شادی میں رات کے وقت اپنے جانے آئے لارک کو توہن کر کے لے گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اٹھل ڈالنی میں سے کسی سے اپنے ساتھ چلے گا۔ مگر اس نے ان سے بات کرنے سے پہلے ہی فائز کا اس کے پاس فون کیا۔ وہ شادی میں جا رہا تھا اور اس سے کہی پھر رہا تھا کہ اگر اس کا جانے کا ارادہ ہے تو وہ اسے اپنے ساتھ لے جائے گا۔

فائز کے فون نے اسے منسلک کیا تو وہ جلدی جلدی جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ فائز کو ان کی کہنی کو پھوٹے اور اپنے پیلا کے آپس کو جو اس کے کالی طویل عرصہ ہو گیا تھا مگر یقیناً اس نے ان تمام عرصہ میں ہاں صاحب کے ساتھ رابطہ رکھا تھا۔ تب ہی تو وہ اسے ادا کر رہا تھا۔

فائز عید کا دن کتنا خوب صورت ہے۔ اسے زارا کی بہن سنی پڑے سر سے اسے دے دے۔

وہ دونوں شادی میں پہنچے تو حسب توقع ہاں صاحب کا چہرہ انہیں دیکھ کر کھل اٹھا۔ انہوں نے ان دونوں کا وہاں انتظار کیا۔ وہ ان کے آئے پر بے پروا خوش تھے اور ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ انہیں کمال تھیں اور کس طرح ان کی خاطر کریں۔ فائز نے ان کی ہولکاتیں کم کرنے کی کوشش کی اور ان سے یہ کہا کہ جہاں باقی سب مسلمانوں کو

خانے کا انتظام کیا گیا یہ دونوں بھی ہیں نہیں گئے۔

ان دونوں کے بہت شدت سے منع کرنے کے باوجود بھی ان صاحب نے کھانے کے وقت ان دونوں کے لیے اپنے کمرے کے دروازے پر دم میں کھانے لگا دیا تھا۔ کسی اقلیتی کے لوگوں کو پھینک دینے کے بارے میں ان کے اصرار کو روک کر ان کا دل توڑ نہیں سکے تھے۔ کھانا بہت سادہ سا تھا۔ ایک معمولی سا چائے اسی پتے اپنی محنت کی جائز کمائی میں سات بیویوں اور دو بیٹوں کو تسلیم بھی روکتی ہو اور پھر ان کی شکایاں بھی کرتی ہوں اپنی ہی اس سے بہتر شادی نہیں کر سکتا تھا۔

ظاہر غیر عجیبہ اور لا پرواہ سا نظر آنے والا یہ انسان اندر سے کتنا سانس تھا۔ وہ سوں کے احساسات کی اسے کس قدر برداشت تھی۔ وہ فائز کے لفظوں کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کے وہ دونوں بہت خوش تھے کہ ان انہوں نے اپنی مصروفیات میں سے چند گھنٹے نکال کر ایک انسان کو خوشی دی تھی۔

"فائز! تمہیں چاہیے کہ تم نے تمہیں بہت پیارا دل دیا ہے۔ محبت اور غصوں سے بھرا ہوا۔" گاڑی میں دوڑ پر ہاتھ فائز اس طرح کی نظر پڑیں۔

"تمہیں یہ بات آج بتا چکی ہے؟"

"نہیں پہلے سے بتا رہے تھے آج کہہ رہی ہوں۔"

"یار! سنا" محبت اور غصوں سے بھرا دل تو اللہ نے

تمہیں بھی دیا ہے۔ ہر ایک جیسے جس شب ہی تمہیں دوست

ہیں۔ وہ کیا کہا جاتا ہے کہ انسان جیسا کہو نا ہے ویسے ہی

اس کے دوست ہوتے ہیں۔" وہ فائز کی بولی غریب پر جو

کہ کافی عجیبہ کی ہے کی کئی کئی دفعہ سنا کر۔

"ویسے سنا" تمہیں میری خوش نظر رہی ہے وہی کسی

کو میری سب سے بڑی خاطر تھی۔

میں زارا تعلیم کو اس کی سب سے بہتر نصیب لڑکی

سمجھتی ہوں۔ اسے تم جیسے اچھے انسان کا زندگی بھر کا ساتھ

مل رہا تھا اور وہ۔" وہ بولتے بولتے ایک دم ہی خاموش

ہوئی۔

"جیسے تم زارا کو بہ نصیب کہہ رہی ہو۔ ایسے ہی میں میر

رہا کو کہتا ہوں۔ ہم دونوں کا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی

زندگی کا ساتھی بنانے کے لیے غلط انسانوں کا انتخاب کیا

تھا۔ فائز نے سچیدہ کہے ہیں تب تو کیا اور اس ہم کو کس کر

ایک بل میں ہی اس کا فحش اور سوز رخصت ہو گیا۔ وہ اب

بچنے فائز کو دیکھ رہی تھی۔

"اما! تمہیں نہیں لگتا؟ ہم دونوں نے غلط کاموں کا جنا

ہم دونوں کے ہمارے لیے درست انتخاب نہیں تھے جن سے

ہم دونوں نے بہت محنت کی جن سے ہم دونوں نے بہت

کامیابی حاصل کی۔ میری ہم سزا باغی علی جیسے کوئی

فائز کو اور حساس سائل رکھنے والی لڑکی ہوتی چاہیے تھی

اور تمہارا فائز عید جیسا کوئی۔"

"فائز! یہ کیا ہے کہ لڑکی کا ہمیں شروع کر دینے۔ چل

کسی اور فائز پر بات کرتے ہیں۔" اس نے اپنے ساتھ

کچھ گھبرا کر اس کی بات کاٹ دی تھی۔ وہ پتا نہیں کتنے

کس طرف لے جانے کا تھا۔

"کسی اور فائز پر نہیں۔ میں آج تم سے اسی فائز پر

بات کرنا چاہتا ہوں اور میں بہت دلوں سے تم سے اس

موضوع پر بات کرنا چاہ رہا ہوں۔ میں صرف یہ سوچ

پریشان تھا کہ بات کس طرح کر لوں۔ تمہاری ناراضگی سے

ڈر رہی تو گنتا ہے۔"

حساب رفتار سے گاڑی بدلتی دیکھتے وہ ایک نظر اس

پر ڈال کر بولا۔

"میں کی زندگیوں میں اب ہماری کوئی اہمیت نہیں رہ

ہمیں بھلا کر اپنی اپنی دنیاؤں میں گم ہیں ہم کب تک اس

کے پیچھے جانے کا سوچ سکتے ہیں گے؟ مجھے حیرت ہوتی

ہے اتم اپنے ساتوں میں اس سوگ اور ہوگ سے گھبراہٹ

نہیں۔ میں تو وہ ساتوں میں ہی آگیا ہوں۔ بلکہ اب

سوچو تو یہ سوچ کر خود پر غصہ آتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی

کے دو چھٹی سال اس کے لیے گواہی دی کہ مجھے کس کے لیے میں

کوئی اہمیت رکھتا نہیں۔ جسے اس بات سے کوئی سروکار

نہیں کہ فائز عید جیسے پورے دو ساتوں سے تھا اور

خاموش زندگی گزار رہا ہے۔ زارا کو امریکہ کے دو سال

گئے وہ وہاں خوش باش لیکن اپنی شادی شدہ زندگی زارا

رہی ہے اور میں یہاں کا نام ہاتھوں کی طرح اس کی یاد میں

آہیں بھر رہا ہوں؟ میری زندگی اتنی فالتو اور بے مقصد

نہیں کہ میں ایک بے حس لڑکی کے پیچھے اسے بھرا کر

ہوں۔"

وہ کچھ گھٹے سے یوں بولا جیسے اپنی زندگی کے دو سال

شائع ہو جانے پر خود سے برہم ہو۔

"تم شادی کرنا فائز! میں ابھی لڑکیوں کی کوئی کی

نہیں۔" وہ قصداً غیر معمولی سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے

ہوئے ہوئی اس سنجیدگی میں یہ سنجیدہ بھیجی ہوئی تھی کہ

اس کی چند گھنٹے پہلے کی اصراری بات اسے پتا نہیں آتی

تھی۔

"تمہارے مشورے سے پہلے ہی میں شادی کا فیصلہ کر

چکا ہوں اور میرے اور گرد و موبر لڑکیوں میں ابھی لڑکی

صرف ایک ہی ہے اور وہ تم ہو نا۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ لب پر اور راست اس کی طرف دیکھ

رہا تھا۔ "تجارت سے سوچ اس کے ذہن میں کب تک تھی اور

کیوں؟ ان کے درمیان ایسا رشتہ تو کبھی نہیں رہا تھا۔

"تم کب تک اس کم ظرف اور گھٹیا شخص کے پیچھے

اپنی زندگی بھڑک رہی ہو؟ ایسی خفا اور اس زندگی؟ زندگی

کی سب خوشیوں پر تمہارا پورا حق ہے۔ کیا تمہیں ابھی

میں اس کا نظارہ ہے؟"

"نہ سمجھے اس کا نظارہ ہے اور نہ میری زندگی میں اس

کے لیے کوئی جگہ ہے میں اس سے شدید نفرت کرتی ہوں۔

میں اپنی زندگی سے خوش ہوں۔ میں اپنی زندگی میں اب

کسی بھی طرح کی کوئی تبدیلی نہیں چاہتی۔ تم بہت اچھے ہو

فائز! تمہارا نصیب یہ نہیں کہ تم ایک شادی شدہ لڑکی سے

شادی کرو۔ تمہیں تو کوئی بہت پیاری سی

بھڑک رہی تھی چاہیے۔ چاہے وہ شخص اس قابل تھا یا

نہیں مگر میں اس سے محبت کی تھی اسے دل کی تمام تر

چاہوں کے ساتھ اس میں کسی دوسرے شخص کو کیا اس

کتنی ہوں؟"

اس نے بھی جہاں۔ سیدھا فائز کی آنکھوں میں دیکھتے

ہوئے سچیدہ اور وہ نوک کھینچے میں کہا۔

"محبت تو میں بھی کرنا ہوں زارا کے ساتھ تو میں اس کا

مطلب ہے کہ اب میں اس محبت کی یاد میں اپنی زندگی

گزارا دوں گا؟ تمہیں لگتا ہے ایسا ہی نہیں مجھے محسوس کرتا

ہوں لیکن اب میں کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔ مجھ میں

ایک نئی زندگی کی شروعات تو کر سکتا ہوں اس کے ساتھ

جسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں جو میری دوست ہے۔

جو بالکل میرے جیسے ہے۔ جہاں کہ ایک بیسٹا ہے نا۔ ہم

ایک دوسرے کو اچھے بغیر "محبت" بولنے بغیر ایک ہی

زندگی کا آغاز اس امید پر کرتے ہیں کہ وقت گزرنے کے

ساتھ جب وفات دہم بھرتے جائیں گے تو ہماری دوستی

محبت میں خود بخود بدل جائے گی۔" وہ اپنے حوڑ کے

برخلاف اشتیاق زیادہ عجیبہ تھا۔

"میں تمہاری طرح نہیں سوچتی فائز! مجھے اب شادی

کے نام سے بھی نفرت ہے۔ میں تمہارے غلوں کی قدر

کرتی ہوں۔ مگر اتم سو رہی جو تم چاہتے ہو وہ میرے لیے

بالکل ناممکن ہے۔" اس کا لہجہ اور وہ نوک اور قطعیت بھرا

تھا۔ فائز بے گت سی خاموش ہو گیا تھا۔ اپنی کاروائی ان دونوں

نے خاموشی سے کا تھا۔ لازماً نے گاڑی کھرکے گیٹ کے

ساتھ لاکر دی تو وہ دروازہ کھول کر فوراً گاڑی سے اتر

گئی۔

"فائز! تم میرے انکار کا برا مت مانتا لیجئے۔" دروازہ

اپنے بند کر کے وہ گاڑی میں بیٹھ کر اس سے بولی۔

"میں نے تمہارے انکار کا برا نہیں مانتا ہے اب مجھ میں

نے اسے قبول بھی نہیں کیا ہے۔ اسے بڑے فیصلے کے بعد

میں نہیں ہوتے نا! جب میں زارا تعلیم جیسی خود غرض

لڑکی کے لیے اپنی زندگی کے دو سال گواہی دیتے ہیں تو میں

بہت اچھا سمجھتا ہوں اور جو واقعی بہت اچھی ہے۔ اس کا

جواب دے لے کر انتظار کریں نہیں کر سکتا؟ اتم اس بات پر

دوبارہ سوچتا۔ "جو خود غرض اور کم ظرف نہیں ہو نا۔"

اسے جواب میں کہہ گئے کاٹو گے بغیر وہ گاڑی بٹارٹ

کر کے ایک دم ہی دھڑکی سے چلا گیا تھا اور وہ گھٹے گھٹے

قدموں سے چلتی اندر آئی تھی۔

اس نے سوچا کہ وہ دروازہ فائز سے اس موضوع پر بات

کرے کی مگر عتا وہ بات کرنے کے لیے اسے اس موضوع

کی طرف لانا چاہتی تھی وہ بات کو اور اچھا کرنا اس

پل جانے۔ فائز نے دوبارہ اسے اس موضوع پر آنے نہیں دیا

تھا۔ فائز کا اس کے ساتھ دوستانہ انداز کسی تبدیلی کے بغیر

وہی سی تھا۔ وہ اس کے ساتھ بالکل پہلے کی طرح تھا اور

ہاتھیں کر آؤں جیسے آئے ہاں گھل اس نے شادی کا پرہیز ہونا

کے ساتھ رکھی نہیں تھا۔

وہ اپنی روزمرہ استعمال کی اشیاء جس اسٹور سے پہلے

خرید آئی تھی ابھی بھی وہاں سے خریدتی تھی۔ حالانکہ

اب ان چیزوں میں اس کا گھر میں تھا جو وہ اسٹور اس کے

گھر سے قریب نہ ہو۔ اس اسی پلے سے خریداری کرنے

کی عادت ہی ہو گئی تھی۔ اس کے گھر وہ بیکس سے وہی

میں اور بھی کچھ دیکھنے والے دن دہلی آجاتی تھی۔ اپنی



مذہب کی انشاء اللہ اعلیٰ اور یہ تیزی سے اپنی نرالی میں
رہے ہمارے ہی۔ وہ قانون فلیکس کا ڈبا اور دوسری دو
نیں پڑیں لے نرالی میں ڈالنے کے لیے مڑی ہی تھی کہ
ساتھ سے اندھا بند بھاگ کر آتی ایک پھونسی سی پچی اس
سے لڑائی۔

ماہا اس پڑ کے لیے قلعہ تیار نہیں تھی۔ اسی لیے
اپنے ہاتھ میں موجود اشیاء کو کوشش کے باوجود سنبھال نہ
پائی۔ اگر ایک طرف اس کا سامان گرا تھا تو دوسری طرف وہ
پچی بھی بہت زور سے منہ کے بل پینے کا ٹکڑا لے کر فرش پر
گر پڑی تھی۔

"اوہ مائی گاڈ۔" وہ اپنے سامان کو چھوڑ چھاڑے ساختہ
گھٹنوں کے بل پیچھے بیٹھی اور اس پچی کو اٹھایا۔ اس کے
گرنے کی آواز اتنی زوردار آئی تھی تو چوٹ بھی کالی زور
سے پی گئی ہوگی۔

"کہاں چوٹ لگی ہے پٹا؟" وہ آنکھوں میں ڈھیر
سارے آنسو لیے ماہا کو دیکھ رہی تھی اور ماہا تیزی سے اس
پر نظریں دوڑاتے دیکھ رہی تھی کہ کہیں خون تو نہیں نکل
رہا۔

"اس طرف سے بھاگو گی تو چوٹ تو لگے گی۔ ویسے ہمار
بچے اتنی ہی چوٹ پر روتے تو نہیں۔" اس کے آنسو صاف
کرتے ہوئے اس نے اس کے گل پر پیار کیا۔ پچی نے اس
بار خاصی دلچسپی اور توجہ سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ گلابی
ہونٹوں سے سن گالوں اور دونوں گالوں پر خوب گہرے گہرے
ڈھیلنے رکھنے والی وہ بے تحاشا خوب صورت اور صحت مند
پچی تھی جو شاید چار پانچ سال کی ہوگی۔ ماہا کو دوست کیوٹ
اور بالکل لڑیا جیسی لگ رہی تھی۔ آنکھوں میں شرارت
کے ساتھ ڈھیر ساری مصحوبیت لیے ہوئے۔ اس نے
سرخ ٹکڑا سلیمیں فراک پر سنا ہوا تھا اور بالوں کی سیدھی
مانگ نکال کر بالکل سامنے کی طرف چھوٹے چھوٹے
پیارے سے ہیر کلپ کلپس لگائے ہوئے تھے۔

"یہ اسٹرابیری کیا اصلی ہے؟" اس نے شرارت سے
اس کے ہیر کلپ کی طرف اشارہ کیا۔ پچی نے اس کی کم
عقلی پر افسوس کرنے والے انداز میں زور زور سے لٹی میں
سر ہلادیا۔

"جی نہیں۔"
"چاکلیٹ کھاؤ گی؟"
"جی۔"

"میلے اپنا نام بتاؤ اور یہ بھی کہ کس اسکول میں پڑھتی ہو؟"
پھر چاکلیٹ ملے گی۔" اسے اس پچی سے باتیں کرنے میں
مزہ آ رہا تھا۔

"اے۔" اس نے اپنی باریک سی آواز میں اسے اپنا نام
اور اپنے اسکول کا نام بتا دیا۔ وہ انگریزی بول رہی تھی۔
اسے شاید اردو سمجھتی تو اتنی بھی مگر بولتی نہیں۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی اور پھر اپنی نرالی میں سے دو چاکلیٹ
نکال کر اس کے ہاتھ میں پکڑا اس میں جو وہ بھاگتی کے پیٹے کے
لیے ہر بار خرید کر لے جاتی تھی۔

"اے اے! تمہارا نام بھی بہت پیارا ہے اور تم بھی بہت
بہت پیاری ہو۔" اس نے اس کے گالوں کو ہولے سے
چھوا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک چاکلیٹ
پکڑے بہت خوش کھڑی تھی۔

"میں کب یہ آئی۔"
"ہو آؤ۔" وہ اس کے مینڈر کے مظاہرے پر
مسکرائی۔

"ارے۔ کیا گرا ہے؟" ایک دم ہی اس کی نگاہ پچی کے
پیروں کے پاس پڑی سو نے کی چین پر پڑی۔ اس کے منہ پر
پچی نے بھی فوراً "اسی طرف دیکھا۔"

"آئی اے میری ہے۔" ماہا اتنی دیر میں زمین پر سے چین
اٹھا چکی تھی۔ زمین پر گرنے سے چین میں پڑا لاکٹ کھل
گیا تھا اور اس میں لٹی تو تصویریں فوراً "ہی اس کی نگاہوں
کے سامنے آ گئی تھیں۔"

"یہ میرے لانا ہیں۔" پچی خوشی کے ساتھ کچھ فرفرے
سے انداز میں اس نے ماہا کو بتایا اور ماہا ان تصویروں کو دیکھ
کر اپنی خوش مزاجی لمحہ بھر میں بھول چکی تھی۔ اس کے
چہرے پر سے مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔ سنجیدہ اور
گرجت چہرے کے ساتھ اس نے اے اے میرے رضا کے ہاتھ
میں اس کی چین دے دی۔

"اے اے! کہاں چلی گئی تھیں تم؟ میں سب جگہ
جہیں ڈھونڈ رہی تھی۔" وہ فلپا پتی عورت شاید اس کی
گورس تھی یا مینڈ۔ گہرائے ہوئے انداز میں وہ بھاگتی ہوئی
پچی کے قریب آئی تھی۔ پچی کے بل جانے کے باوجود اس
کے چہرے کی ہوکھاہٹ اور پریشانی غائب نہیں ہو پائی
تھی۔

"میں ان آئی سے باتیں کر رہی تھی۔" ماہا نے نہ پھر
اے اے میرے رضا کی طرف دیکھا اور نہ اس فلپا پتی عورت کی

طرف۔ وہ فوراً اپنی زالی کی طرف بڑھی اور پھر بغیر مزے
تیزی سے اپنی زالی کا تئری کی طرف لے گئی۔ اہل میر رضا
مرد سے تو انہوں نے اس سے کچھ کہہ دی تھی۔ اس سے
پتہ چل گیا کہ وہ اس کے پاس آئے وہاں سے بھی جانا چاہتی
تھی۔ یہاں پہلے کہہ دینا تھا، اسور سے نکل آئی۔
گلابی ڈرائیو کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے پار پار
وہ تصویریں آ رہی تھیں اور ساتھ ہی اہل میر رضا کا من
موسنا اور معصوم چہرہ اس پر لکھا تھا۔ اس کے بائیں کاندھے پر
رہا تھا اور ایک سیلینس پر پاؤں رکھے۔ اندر سے اس کی نفرت کی
شدید لہر اسے بلے کاہ کر رہی تھی۔ اپنی ماموں، اپنی
عمو سیال اور اپنی خالی گوداں کے دکھوں اور اس کی نفرتوں
کو بڑھاتی تھی۔ پھر نفرت کا یہ احساس خود اپنے آپ پر بھی
میں بد لے گا۔

اس شخص کی محبت میں اندھی ہو کر اس نے اس کی
ایک ناجائز بات کہیں بانی؟ ہاں بنے گا اس کا نظری حق ہو
دینا کا کوئی مذہب، معاشرہ اور انسان اس سے نہیں بچیں
سکتا تھا۔ اس شخص نے مجھے رکھا اور وہ اس کی محبت میں
پاک ہو کر اپنی خواہش کے برخلاف اس کا من مانا فیصلہ
قبول کیا۔ یہ سب زراعت کر کے اس کے فیصلے کے خلاف
جانی ہوئی۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہو؟ اسے بھروسہ تھا تو
کیا ہوا اسے مانگے والا ایک بیوروہ اگر اس کی اپنی بیٹی
ہوئی تو کتنی بڑی ہوتی۔ وہ دوا دوا سال کا حساب لگائے تھی۔ وہ
اسکول جاتی ہوئی۔ پھر زندگی میں کسے کو کتنا کچھ ہوا اگر نہ۔
"اما میرے اسکول میں ہیوینس میٹنگ ہے۔"
"اما مجھے بینس اور در چاہیے۔"
"اما مجھے سائنس کا امتحان ملنا ہے پلیز میری

بیلبل کر دیں۔"
"اما میں اسپورٹس سے میں بلی ہاؤس؟"
"اما میری فرینڈ کے پاس ایک چارڈاول ہاؤس ہے۔ آپ
مجھے بھی دیا چاہوں ہاؤس لا کر دیں ناں۔" اس نے اپنی برابر
والی خالی سیٹ کی طرف دیکھا۔ وہ یہاں بیٹھی اور پھر آتہ وہ
بھابھی کے بچے سے بھی پہلے اسے چاہی تھیں اور اس
کے کیم ویا رہی ہوئی اور اب وہ اس کے برابر اس سیٹ پر اپنا
سامرا فرمائی سالانہ اپنی گود میں لیے بہت خوش اور مگن
بیٹھی اس سے باتیں کر رہی ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے وہ
آنسو بڑی خاموشی سے گریں اور اس کے لپٹے میں
جذب ہو گئے۔

اہل میر رضا سے ملنا ایسا واقعہ نہیں تھا جسے وہ بہت
تسلی سے بھول جاتی۔ اپنے سارے دکھ اور اپنی ماموں
محمود سیال اسے لئے سب سے زیادہ آگئی تھیں۔ وہ اس
واقعہ کو کسی اور سے تو کیا کلام اور غارت گے سے اس کو
نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی نہیں
پاتی تھی کہ وہ اہل میر رضا سے ملے۔ بالکل اٹھاتا اور
اس اتفاق نے اسے کتنے بہت سارے دنوں تک اس پر
کیے رکھا ہے۔ حیرانہ وہ اپنے دل کی باتیں اپنے دوستوں
سے کسی بھجک کے بغیر کہہ سکتے تھے۔ قتل ہو جانے کی؟

اس واقعہ کو ایک ڈیڑھ مہینہ گزر چکا تھا جب اس روز
صبح وہ اپنے ہمں میں بیٹھی کام کر رہی تھی۔ صبح کے
ساڑھے نو بج رہے تھے اور وہ اپنے سامنے رنگے پنڈ
کاغذات پر دستخط کرنے میں مصروف تھی۔ اسی وقت اس
کی ٹیکسٹری نے انٹر کالیں اس سے رابطہ کیا۔
"ہیو کوئی میر رضا صاحبہ آپ ملنا چاہتے ہیں۔"
اس کی آنکھوں نے دستخط کرتے کرتے چن کو اتاری تھی سے
دیکھا کہ اس کی بٹ نمٹ گئی۔ وہ یہاں کیوں آیا ہے؟ وہ اس
سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟ اتنے برسوں سے وہ اس شخص کے
ہم تک سے نفرت کرتی آ رہی تھی تو اس کی عقل بگڑا کر
مگر اگر کرتی؟ بہت مشکل سے اس نے اپنے منہ اور اپنے
لبے کی کڑواہٹ کو ایک پروفیشنل یون کے پیچھے چھپایا
اور اپنی ٹیکسٹری سے تعجب کی کے ساتھ احتیاط کیا۔
"میں سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں۔ آپ نے پوچھا نہیں
؟"

"ہیم! وہ کہہ رہے ہیں انہیں آپ سے کچھ پرس
نوعیت کا کام ہے۔" اس کی ٹیکسٹری کو جواب "شام کی
ہوئی۔"
"نن سے کہیں! ابھی میں بہت بڑی ہوں۔ وہ انتظار
کر رہی۔" اپنا پروفیشنل فوجہ برقرار رکھتے ہوئے اس نے
بات نہ کی۔
"پرسل نوعیت کا کام؟" نفرت سے سوچتے اس نے
زیر لب دہرایا۔ ہاں ایک پرسل نوعیت کا معاملہ ان کے
درمیان طے ہو نا چاہی ہائی تھا۔

Some unfinished business ایک

کاغذی کارروائی اس نام نہاد رشتے کو ختم کرنے کے لیے
عین افغان کی ادائیگی۔ مگر اس نام سے لیے بھی وہ براہ
راست اس شخص سے کوئی رابطہ نہیں چاہتی تھی۔ اب وہ
گوداں اور علی نہیں رہی تھی، وہ اپنے آپ میں صرف اس
شخص کی فون پر گواہ کر رہی زار و قطار بڑی تھی۔ یہاں
سارے پہلے کی ماما اور علی اور آج کی ماما اور علی میں زمین
آسمان کا فرق تھا۔ اسی لیے وہ سون سے انداز میں اپنا کام
تعماتی رہی۔ نچ پانچ شروع ہوا تو اس نے اپنے کام پر اپنی
ٹیکسٹری سے کہا۔

"ہو صاحبہ مجھ سے ملنے آئے تھے وہ اگر ابھی بھی
موجود ہیں تو انہیں اندر بھیج دیجیے۔"
"ہیں سیم؟" اس نے اپنے سامنے رکھی فائل بند کر
دی اور سب کارروائی ختم کر کاغذات کرنے لگی۔ پنڈ سکند
بین میں دروازہ کھلا اور اس شخص نے اندر قدم رکھا۔ وہ
صرت دم تک بھی وہاں رہی دیکھ نہیں چاہتی تھی۔ سر
اٹھا کر اپنا جوتہ دھو سے چلا آتانی بیٹی اور بہترین تراش
خراش والے سیاہ رنگ کے سوٹ میں وہ کسی سینئر یون
انگریز کی طرح نظر نہ رہا تھا وہ خود سے ملنے کے لیے آئے
والے برس ایسی ہیٹ کی طرف پیشہ دران انڈاز میں
دلچسپی رکھتے۔
"ہیں ہو ہوا؟" وہ اس کی میز کے سامنے آکر روک گیا
تھا۔

"آپ مجھ سے کس سلسلے میں ملنے آئے ہیں مسٹر میر
رضا؟" ہاں نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں
سمجھا تھا۔
"اما میں۔"

"ایک منٹ مسٹر رضا۔ میر خیال ہے میں چاہتی ہوں
آپ مجھ سے کس سلسلے میں ملنے آئے ہیں۔"
اس نے اس کی بات کٹ کر بات کیجے میں کہا۔
"یقیناً۔ آپ مجھ سے divorce (طلاق) کی بات
کرتے آئے ہیں۔ اگر کی بات ہے تو میں سمجھتی ہوں بہتر
یہی رہے گا کہ آپ یہ کام اپنے وکیل کے ذریعے کروائے۔
ہم دونوں ہی اپنی اپنی زندگیوں میں اتنے مصروف ہیں کہ
تاریت پاس اس طرح کے معمول معاملات میں الجھنے کا
بالکل وقت نہیں۔ آپ اپنے وکیل کے ذریعے مجھے بھیج
دیجئے۔"
"It's so simple"
"اما تم میرا اس لیے مجھ سے بات مت کرو۔ میں

کسی ڈیووس (طلاق) کے لیے تم سے بات کرنے نہیں
آیا ہوں۔"
وہ اس کی میز کے سامنے رکھی کر رہی پر بیٹھے ہوئے
ہو سکتی سے ہوا۔

"اب کس کی ڈیووس مسٹر رضا! میں نے آپ سے بیٹھے
کے لیے ہر کڑ نہیں کہا۔" اسے نوکرتے وقت بھی اس کا کچھ
بہتر پروفیشنل اور مذہب رہا۔
"ہیں بہت بڑی ہوں۔ یہ میرا ہی نام ہے اور اس کے
بعد مجھے ایک بینک میں جانا ہے لہذا آپ کو جو کچھ بھی
کہتے ہیں وہ مختصر گفتگوں میں جلدی کہہ دیجئے۔" وہ جواب
میں کچھ کہنے کے بجائے ایک نلک اس کی سرت دیکھے چارہ
تھا۔ کئی منٹ بعد وہ اس کی طرف دلچ کر رہے تھے میں
ہوا۔

"اما میں جانتا ہوں میں نے تمہارے ساتھ بہت
زبانی کی ہے۔ میں تم سے شرمندہ ہوں۔ میں نہیں اپنے
ساتھ لے جانے آیا ہوں۔ جو کچھ ہوا اسے بھلا کر ہم
سے ایک ساتھ اپنی زندگی شروع کر سکتے ہیں! اما!"
"مسٹر رضا فرسٹ نیمز Name Terms First
فرسٹ نیمز اور میان کب کے ختم ہو چکے۔ میں آپ
کے ساتھ رہا ہوں تاہم میں چاہتی لیکن یہ بے تعلقی سے ہوا
کہنا۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے میں کیا کہنا چاہتی
ہوں۔" وہ ہلے سے نکلی۔

"اما! تم مجھ کو کچھ بھی کہو تمہیں حق ہے کہنے کا میں
نے واقعی کھنا۔ ساتھ اچھا نہیں کیا ہے۔ لیکن میرا
یقین کرنا ہوتا ہے اور جا کر میں ایک دن بھی خوش نہیں رہا۔
پھر زندگی میں وہاں تھا ہاں پلیز۔ تمہارے بغیر میری
زندگی بہت اداس ہے بہت دوران ہے۔" وہ اس کی طرف
دیکھ کر بہت فخر کھڑی ہو سکتی سے ہوا اور وہ ہوا "فقط۔" گ
کریاں بیٹنے لگی جیسے میر رضا نے اسے کوئی بہت دلچسپ
الحقہ سنایا ہو۔

"آج آپ ایڈیشنل اور بیڈی ہو رہے ہیں مسٹر رضا!
بلکہ آپ نے نوٹ کیا ہو گا کہ میں اپنی عاقبت سے نکل
کر آپ کے ساتھ ایک بڑی کمی ہو رہی ہے۔ لیکن اور میرا
عورت کی طرح نو بیٹل سے (منجلی انداز) میں بات کرنے
کی کوشش کر رہی ہوں۔ ان جذباتی باتوں میں کچھ نہیں
رکھا مسٹر رضا! آپ جو کہنے آئے ہیں وہ کچھ۔" وہ لا "میر
کے بارے میں۔ اب دیکھیے۔" آپ تو مجھے خیرات کے طور

فریج میں تھے۔ مگر کیا کروں۔ تب کی بھی ایک پینٹ کی کمی محسوس نہیں رہی ہوں تو یہ انسان کیسے غور کرتی تھی۔ میں نے سارا فریج پچاس پڑا میں فروخت کر دیا تھا۔

حساب کچھ بول رہا تھا۔ مسٹر ضامن کے پاس پڑا میں سے آٹھ پڑا میں اپنے جیڑے کے فریج کے کال لوں تو پچاس پڑا میں آپ کے میرے حصے میں آتے۔ یعنی میرے حصے کے ایک لاکھ روپوں میں سے پچاس پڑا میں بیٹے کے بعد آپ آٹھ جیڑے کے افغان پڑا میں دیں گے۔ اس کی منظر ابھرتا ہے اور ابھرتی ہے اور کال دار تھا۔

"ابا! میرے ساتھ اس طرح کی دوست کرو۔ میں بے دل اور بے غصے غلوں کے ساتھ ہمارے پاس رہاؤں گا۔ میں پچاس پڑا میں سب باتوں کو بھلا کر بیٹے ایک موقع اور دو۔ میں اپنی سب غلطیوں کا ازالہ کر لوں گا۔ وہ ایک بار پھر بہت نڈر ہے۔ کھلا کر کہیں پڑی۔"

"آپ کو ایک بات بتاؤں مسٹر ضامن! یہ امرت دہلی کا یہ دل جذبات اور غلوں جانب کے الفاظ آپ کو باطل سمجھتے ہیں کہ جب ان فیکٹ آپ کے منہ سے نکلے کے بعد یہ الفاظ بہت کڑے اور بد صورت لگ رہے ہیں۔ وہ اس پر سے تقریر بنا کر اپنی بھلی پر کچھ دھونڈنے لگی تھی۔"

"ابا! میں نے سچ بتایا ہے۔ آپ کے پاس کرنے کے لیے کوئی خاص بات تو ہے نہیں اور مجھے شک میں جانے کے لیے اور ہو رہی ہے۔ وہ اپنا ماکل اور سن گا۔ سب سے بڑا مسئلہ ہے کہ آپ سے کوئی ہوئی پھر اپنا پر سن گئے۔ صبر رہا۔ اتنے ہوئے ای پروفیشنل سے انداز میں بولی۔

"تب کہ divorce (طلاق) کے سلسلے میں کوئی بات نہ کرے کہ وہ کوئی اپنے دیکل کے لیے مجھ سے رابطہ کیجے گا۔"

وہ کمرے سے نکل کر باہر چلی گئی اور وہ بے بسی سے اسے یاد دہان کر رہا تھا۔

"ابن سولہ فروری ہے یہ بات میں نہیں بھولا اور تم بھول گئیں؟ ہمیں کیا لگتا ہے میں سولہ فروری کے دن تم سے طلاق کی بات کرتے آیا ہوں؟" اس نے کرسی کی پشت سے اپنا سر جھکا کر بہت کرب سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

اور جذبات کو ذرا برابر بھی اجماع نہ دینے والے محض نے خود کو کھینچا ہوا۔

"جس دو سالوں اور سات مہینوں کا ساتھ ہے۔ اس سارے عرصہ کی تمام باتیں اس نے اس لڑکی کے ساتھ بتائی ہیں۔ ابھی اسے زندگی سے نکلے عرصہ تھا۔ ہوا ہے؟ فقط اعلیٰ سینے کی اعلیٰ سالوں کے ساتھ کو بھلائے کے لیے بھائی سینے تو بہت کم ہیں۔ اعلیٰ بات ہے۔ شروع شروع میں وہ کیا بھی اسے کی بہت سی باتوں کے ساتھ اس کا خیال بھی آئے گا۔ پھر وقت کے ساتھ وہ ماضی کی وہ باتیں جانے کی شے بن جائے گا۔ ابھی وہ بیان بھی نہیں آئے گا۔

سودہ کے ساتھ غم دار ہوا اسے ایک دم ہی براؤن اور سلی ٹنٹے لگے تھے۔ اس نے اس کے چلوں پر اپنے لب رکھ لیے اور اس کے چلوں میں سے اتنی ایک پیاری سی سوانحی ہی باتوں خوشبو کو جیت کے ساتھ اپنے قریب بکھرا۔ محسوس کرتے تھے۔ کتنی حیرت کی بات تھی کہ سودہ بھی وہی شیبہ استعمال کرتی تھی جو وہ استعمال کرتی تھی۔ اعلیٰ تب وہ وہاں رہا۔ وہاں میں نہانے کھانا تو اپنی رات کی کیفیت کو پوری طرح بھول گئی تھی۔ اسی لیے اس نے پہلی مرتبہ سودہ کے پیچھے اور کونڈر کو دھیان سے دیکھا۔ وہ وہ میچو نہیں تھا۔ لیکن کیا پتا اس کی خوشبو بھی اس پیچھے بھی سی ہو۔

وہ ہاتھ روام میں کھڑا ایک بچکانہ اور امتحان حرکت کر رہا تھا۔ وہاں اسے سب کرنا دیکھنے والا کون تھا؟ اس نے شیبہ کی بول اٹھا کر اس کا اسٹیک کھلا۔ وہ ایک بالکل نیا مختلف خوشبو تھی۔ اپنی حلقوں پر خود کو سرزنش کر رہا تھا۔

روم سے نکل آیا تھا۔ یہ امریکہ میں اس کی شاندار زندگی کا آغاز تھا۔ وہ سودہ کے ساتھ بہت خوش تھا۔ اس کے دوستاں سے تو یہ بہت باتوں پر خوش تھا۔ زندگی نے اسے بیٹے تک رسائی سب کچھ عطا کیا۔ کبھی سوچا بھی تھا۔ اس نے کہ وہ اس کے تین علاقے میں ایک جیٹ ہاؤس میں رہے گا؟

اس صبح اسے اٹھنے میں کچھ دیر ہو گئی تھی۔ ہاتھ روام میں شیبہ نے اس سے نڈر اور ڈر سے آواز لگائی۔

"ابا! امیری بلو شربت اور گرسٹ بیٹ کال دینا۔" کہتے ہوئے اسے خود احساس نہیں ہوا کہ اس نے ایک غلط نام لے دیا ہے۔ وہ جدی جلدی شاکر باہر لگا۔ اس جھین کے

ساتھ کہ اسے اپنے کپڑے تیار رکھے ہیں گے۔ مگر بال پر ایسا کچھ نہیں تھا۔ جھین کے ہونے انداز میں منہ میں کچھ بڑبڑاتا اور کمرے سے نکلتا تو ایک دم میں شیبہ کے آگے جھکی سدرہ نظر آئی۔ پیوئورٹی جانے کے لیے مکمل تیار وہ بیٹھ رہی تھی۔ بائیں ہاتھ سے ان دونوں کے ساتھ تھانے بھلنے لے اپنی ایک ہالی ملازمہ بھی بیچ دی تھی اور اس وقت وہی ملازمہ کھانے کے لوازمات میز پر رکھ رہی تھی۔

"تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے میرے؟" اس نے اخبار سے نظرس ہٹا کر اسے دیکھا۔

"ہاں ہو رہا ہوں۔" وہ کھوئے کھوئے سے مجھے میں بولا۔

"جلدی کرو۔ ورنہ دوپہر ہو جائے گی۔" وہ اپنی پلیٹ میں اجماع ڈالنے لگی۔ وہ اپنی کھوئے کھوئے سے انداز میں دیکھنے لگے کمرے میں "ابا! کچھ دیر وہ وہی جھین کی کیفیت کا شکار رہا۔ مگر پھر جلدی جلدی تیار ہوئے وہ اس کی کیفیت سے نکل کر ایک مرتبہ پر اس کی زندگی کو اس کے سامنے کرنے لگا جس کے اس نے بیٹھ خواب دیکھے تھے۔

"ابا! امیری ایک مٹی میں مل رہی۔ بہت جھین لے ہوئے کھینے میں وہ ڈر سے بولا۔ وہ الماری کے سامنے کھڑا ہر طرف ہاتھ مار رہا تھا۔ سدرہ ڈرنک بھل کے آگے کھڑی ایک ایک اپ کردی تھی۔ اس کے منہ سے یہ بول نکلتے کی دیر بھی اس نے ہاتھ میں پکڑا۔ کارا تھا کہ بہت مجھے سے ڈرنک بھل پر پھینکا۔ وہ اس دھماکے پر سبے سادہ سی کھڑا اور اس کے چہرے پر نظر پڑے ہی اسے فوراً یہ احساس ہوا کہ ابھی ابھی اس کے منہ سے ایک غلط نام نکلا تھا۔

وہ فوراً "سودہ کے قریب آیا اور اس سے روانی میں منہ سے نکلے اس نام کے لیے معذرت کی۔ وہ اس وقت سدرہ کے ساتھ ایک بہت اہم ڈانٹیں جا رہا تھا۔ کافور کی ملازمت کے بعد کبھی جا کر سودہ کا موڈ ٹھیک ہوا۔ مگر یہ صرف اس ایک روز کی بات نہیں تھی۔ ہر روز ان مہر میں بھانے لگتی رہا۔

"ابا! میرے جوتے۔"

"ابا! میری شربت۔"

"یہ کہ میرے شوہر صاحب گھر سے جا کر کسی خوب صورت سے خوب صورت لڑکی کو بھی نظر اٹھا کر نہ دیکھیں۔ ان کے دل 'داغ' اور ان کی نگاہوں میں صرف میں رہوں، صرف میرا چہرہ ہے۔"

وہ جواباً شرارتی کتبے میں بولی اور وہ جانتا تھا کہ وہ اس کی سلامتی اور خیریت کے ساتھ کرواہی کے لیے اس پر کچھ بڑھ کر دم کرتی ہے۔ ان چیزوں میں اس نے کبھی یقین نہیں کیا تھا لیکن اس نے مانا کہ ایسا کرنے سے کبھی روکا نہیں نہیں تھا۔

کوئی کام کرتے کرتے اسے سدھ سے کوئی بات کرنا ہوتی تو بے خیالی میں منہ سے سدھ کے بجائے ماما نکل جاتا۔ سدھ کے چہرے پر فوراً غصے سے بھرپور اثر پھیل جاتا پھر ایک بار وہ اس کی ان حرکتوں پر اس سے ٹھیک صاف لڑ پڑی۔ اس نے کہا کہ اس کی بدل کلاس بیوی جو اس کے کپڑے دھوتی تھی استری کرنی تھی جو تے پاش کرنی تھی اس کے لیے کھانے پکانی اور پھر اسے خود اپنے ہاتھوں سے کھلاتی بھی تھی اگر وہ سدھ آفاق سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ اس کی بدل کلاس حرکتیں کرے گی تو یہ اس کی بیویوں ہے۔ گھر میں ملازمہ موجود ہے وہ اس سے اپنے کام کروائے اور جو کام ملازمہ کے کرنے کے نہیں تو وہ زحمت کر کے انہیں خود ہی سرانجام دے۔ وہ سدھ کو ناراض نہیں کر سکتا تھا۔

وہ میرا باپ کی اکاؤنٹ اور لائل بیٹی تھی۔ ظاہر ہے وہ اس کے بچے بچھے پھر کر لائل کلاس بیویوں جیسے کام نہیں کر سکتی تھی۔ جب ہر کام اور ہر ضرورت وقت پر پوری ہوتے ہوئے ایک دم بونا بند ہو جائے تو جس کی وجہ سے وہ کام وقت پر ہو رہے تھے اس کا یاد آ جانا تو ایک لازمی اور فطری بات ہے۔ ماما کے اتنی کثرت سے یاد آنے میں اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ اب چونکہ اسے اپنے چھوٹے چھوٹے کام پہلے کی طرح کیے ہوئے نہیں ملتے ہیں۔ سو ان کاموں کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ یاد آ جاتی ہے۔

اس نے خود کو بہت آسانی سے زمین دھلا کر اپنے چھوٹے چھوٹے کام وقت پر نہ ہونے کی وجہ سے اسے یہ مینشن ہے اور اس میں ایسا کچھ نہیں کہ وہ مابا کو اپنی زندگی میں رُس کر رہا ہے۔ اسے مابا نہیں آتی۔ اس کے ذریعے انجماہنے والے اپنے کام یاد آتے ہیں۔

وہ اپنے خوابوں کے حصول کی جانب کس کامیابی سے رواں دواں تھا۔ ایک سیست میں وہ کلاس سے کھل پھٹا تھا۔ دنیا کے بڑے بڑے ممالک کے سینئر ڈپلومٹس، قسارت کار، بستی سیٹلی ٹیلی ویژن کے سینئر مدیر، ایک بڑے بزنس مین، اوٹو کی بوسٹوں والے امریکی سرکاری ملازمین۔ وہ اتفاق جمل کے توسط سے ان کے درمیان سے ان لوگوں سے مل رہا تھا جن سے ملنا بھی اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ کیا اس آری کے کھنکھس تھے۔ کمال کمال براس کی دوستیاں اور تعلقات تھے۔ دانشور میں بعض ایسی مستقل سیاق اور سماجی شخصیات تک سے ان کی سلام دعا تھی جو وہیں کی سیاسی اور سماجی زندگی میں کافی اثر رکھتی تھیں۔

وہ اپنی زندگی کا ایک بھی مل ضائع کیے بغیر ان تمام چیزوں کو اپنے حق میں استعمال کر رہا تھا۔ وہ مصروف تھا۔ بے انتہا مصروف۔ اتفاق جمل کے ذریعے حاصل ہونے والے تعلقات کو اپنے حق میں استعمال کرنے میں اس کے پاس فرصت کا ایک لمحہ بھی نہیں تھا۔ زندگی میں پیچھے رہ گیا تھا۔ کچھ چھوڑ کر رہا تھا اس بارے میں سوچنے کا اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ زندگی میں پیچھے مڑ کر وہ لوگ دیکھتے ہیں جنہیں آگے بڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ انہیں نہیں دیکھتا۔ آگے دیکھتا ہے۔ بہت آگے آگے جہاں تک خود اس کے اپنے خوابوں کی بھی رسائی نہ ہو۔

آج کل تک اور انہا دنوں کے بلندیوں کی انتہاؤں تک پہنچنے کے کوڑا اور ڈرگمیں اس نے خود اپنے لیے کب سیٹ کیے تھے؟ دس سال کی عمر میں۔ ایک دس سال کا بچہ اور ایسی جنونی سوچ؟ ہاں اس نے اس وقت سے بھری رات میں ایسی سب کچھ سوچا تھا۔

وہ ایک مل کلاس کیٹی سے تعلق رکھتا تھا اور اس کے والدین کا اس کے بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اپنے سب جاننے والوں کو یہی بتایا کرتا تھا۔ جو ذرا قریبی واقف کار اور دوست تھے انہیں ذرا سی تعلیم کے ساتھ یہ کہ اس کے والد ایک معمولی ملازم تھے اور اس نے اپنا بچپن بڑی نعمت اور تحفہ جی میں گزارا ہے۔

ماں تاکہ کو اس نے اپنی فیملی اور اپنے بچپن کے بارے میں سب کچھ سچ نہیں بتایا تھا۔ سچ یہ تھا کہ اس کا باپ کپڑے کی ایک مل میں چڑا رہا تھا جس کو وہ دیکھ رہا تھا۔ وہ نوجوان ایک کمرے کا مکان کھڑکلائے جانے کے مرکز

لاحق نہیں تھا۔ شکستہ حال اور خستہ ایک کمرے کا مکان جو ہر مہم میں لانت رہتا تھا۔ بارشوں میں اس کی بوسیدہ چھت ایسے پانی کے کمرے میں سوکھی کوئی چڑیا نہیں رہ پاتی۔ ان کے سبز تنک پورے کے پورے پانی سے جھلکتے تھے۔

اس نے اپنی ماں کو اپنی پیدائش کے وقت سے ہی یاد رکھا تھا۔ اس کے باپ کو اپنی پوری سے چرمیل سننے پر کرواتے کا شوق جو تھا۔ جن زندگیوں کو وہ دنیا میں لے گیا تھا انہیں دھنک کی رہائش دینی اور لباس کچھ بھی نہیں دے سکا تھا۔ اس لیے کہ اس کے پاس نہ تھا۔

جواد رضا اس سے سولہ سال بڑا تھا اور اس کے اور جواد رضا کے بیچ میں ہر سال اس کے زندہ اور مرنے والی ماں پیدا ہوتے رہے تھے۔

سرکاری اسکول میں اس کا داخلہ بھی اس کا سولہ سال بڑا بھائی جو نو رضا کو لے گیا تھا۔ جواد کو پڑھنے کا شوق تھا مگر وہ پانچویں جماعت تک ہی پڑھ کر گھر کے حالات کو دیکھتے ہوئے اپنی تعلیم کو خیر باد کہہ کر باپ کی دالی میں ملازمت اختیار کر گیا تھا۔ اس باپ کی بہ نسبت جو لوگوں کو زیادہ خیال رکھ لیا کرتا تھا۔ میر کو اس نے اس کمرے میں پانچوں سال اس زندگی سے ہر چیز سے نفرت محسوس ہوتی تھی۔ وہ اپنا پتلا پراٹا بہت لٹکا کر پوند گا پونڈیٹارم پٹے اپنے کھلیا سے سرکاری اسکول جا رہا تھا۔ آج رات میں پڑنے والے اس پڑھنے سے اگلے میڈیم اسکول کو حیرت سے دیکھتا۔ صبح کے وقت وہاں ایک سے بڑھ کر ایک چھٹی گاڑیاں آکر رک رہی ہوئیں اور ان میں سے صاف ستھرا انیا پونڈیٹارم پٹے خوش و خرم بیٹے اتر کر اس کھنک کے کمرے میں داخل ہوئے۔

یہ فرق کیوں تھا اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ وہ اپنے اترنے والے کے ساتھ اپنے باپ کے ساتھ تھی گاڑی میں بیٹھ کر اس پر سے شاندار اسکول میں آتے اور وہ صوفے پر بیٹھ کر اپنا پونڈیٹارم پٹے پہن لیا اس سرکاری اسکول میں جاتے جہاں کی ہر چیز سے نفرت برتی تھی جہاں کی ہر چیز اسے زہر لگتی تھی۔ اپنے کمرے میں اپنے اسکول سے اپنی اس نفرت بھری زندگی سے اسے نفرت تھی مگر یہ نفرت اس رات سے پہلے تک اتنی شدید نہیں تھی۔ اس میں ایسا جنوں اور ایسا ہائمان پن نہیں تھا۔

اولیٰ جنوری کی وہ رات بہت سوچھی۔ بارش بھی

نہ تھی اور اور گرینج تنک کے ساتھ ہوری تھی۔ اس کی طبیعت سخت پتلا تھی۔ وہ ایک اور بے کو ختم ہونے والی تھی اس کی حالت اتنی خراب تھی کہ اسے اپنے تنک کے داخل کرانے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کا باپ گاڑی اسپتال میں بڑی مشکلوں سے اسے داخل کروا لیا۔ اسپتال والوں نے ہزار مشکلوں کے بعد اسے داخل کر لیا۔ اس کا باپ اس کے باپ کے پاس بیوی کے جناح کے لیے اس کی بیوی نہیں تھے۔ اس کی ماں مرنے کو بڑی تھی۔ اس کا قوری طور پر آپریشن کیا جا رہا تھا ضروری تھا اور اس کا باپ کے پاس کوئی چیز نہیں تھا۔

خیر کہ اس کا باپ اپنے ساتھ لے کر اپنے مالکوں کے گھر لے گیا۔ پتہ مانگے جا رہا تھا۔ گھروں پر قیمتی ٹائٹ ڈرائس اور گاڑیوں میں بیوس منہ میں۔ گارہاے صاحبوں نے ہر گھر کا پتہ نہ بھی کیا تو صرف اس کے باپ کو پتہ لے کر گھر کا پتہ لے گئے۔ "میں کہاں سے دوں پیسے میرے کوئی خزانہ ہے۔ تمہاری تو روزی کی کئی کئی ہے۔" صاحب! میں جلدی لوٹا دوں گا! میری پوری مرچا ہے میرے پیسے آج آج ہی میرے صاحب ارم کریں۔" اس نے صاحب سے اپنے پاس کھلے دس روپے کے بیٹے کی طرف اشارہ کر کے رقم کی ہنگامی مانگ کی۔ "میں نے پیسے پیدا کیوں کرواتے ہو؟" صاحب نے اس کے پاس سے پیسے پیدا کرانے کا شوق ہے۔" صاحب نے اس کے پاس سے پیسے پیدا کرانے کا شوق ہے۔

اپنی کوئی بھی کے باوجود اسے یہ سمجھ میں آ رہا تھا کہ اس کے باپ نے اسے اپنے ساتھ کیوں رکھا ہوا ہے۔ بارش کی سخت ترین سردی میں کسی بھی طرح کے گرم کپڑوں کے بغیر ایک دس سال کا معمولی سا بچہ اسے اس حال میں دیکھ کر اس کے دل پہنچ جائیں گے اس کے ان کے دلوں میں ہوری ہر دم کے جذبات جاگ جائیں گے۔

پھر اس کا باپ ہر طرف سے مایوس ہو کر اپنے سب سے بڑے صاحب کے محل چلے گئے۔ گیارہ گیارہ صاحب کا محل بھی اس محل جتنا ہی بڑا ہوا۔ وہ وہاں پہنچے تو یہ گیارہ گیارہ کے ان کے صاحب سوچے گئے۔ "کہہ دو بہت مایوس اس کا باپ اسے لے کر وہاں سے بیٹے کی ذرا سا پیچھے بٹا۔ اس نے اس محل چاہنے کا کوئی کھٹ کھٹا اور اس میں سے ایک سستی جھکی گاڑی باہر نکلی تھی۔

"صاحب! اس کا باپ زور سے چلایا۔ اس گاڑی میں

صاحب اپنی بیگم اور دو بچوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کی تیاریاں تیار تھیں کہ وہ کسی شادی یاہ کی تقریب میں جا رہے ہیں۔ اس کا باپ اندھو حندا اس گاڑی کی طرف بھاگا۔

"جی ہاں! اندھے ہو گیا! دکھائی نہیں دیتا۔" گاڑی کو بریک لگاتے صاحب نے دو چار موٹی موٹی گایاں اس کے باپ کو دے دیں۔ گاڑی کی خبر لگنے سے وہ لاکھڑا کر زمین پر اوندھے منہ گر گیا تھا۔

"صاحب! میری پوری بہت بیمار ہے صاحب! مجھے تھوڑے سے پیسے چاہئیں۔ میں جلدی واپس کر دوں گا۔ اپنے بچوں کے سر کا صدقہ کچھ کر لی مجھے بھلک دے دیں صاحب! میرے بچوں نے پیسے ہیں۔" وہ زمین پر سے بڑی مشکلوں سے کھڑے ہوئے تو وہ رو کر فریاد کرنے والے انداز میں بولا۔

بیک صاحب کی گاڑی اس کی تہیں اور فریاد سننے بغیر ہی دوبارہ اشارت ہو چکی تھی بے بسی سے وہ پھر صاحب کو پکارا۔ اس کا باپ اپنے کمرے سے بیٹے خون اور پوٹ کے سبب دوبارہ زمین پر گر گیا تھا۔ میرے ایک نظر اپنے باپ کو دیکھا پھر اس نے اس محل کی طرف دیکھا۔ اس کا نام اس کی واپس اس کا گیت اس کے پورچ میں کھڑی تھیں شادار کا زون کی طرف دیکھا تو بچوں کا کھلی شاداری تھیں اور چو بھی گاڑی جو سب سے بھٹی تھی وہ وہ بھی شے وہ تری! ابھی اس پورچ سے نکل کر لے جا چکا تھا تھے اس کا باپ صاحب کہہ کر کھٹک کر رہا تھا۔ اندھیرے میں بھی اس نے اسے امیر کبیر شخص کے رگونے بھرے مغرور چہرے کو بخود دیکھا تھا۔ اس نے جو قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا اسے بھی زبورات اور قیمتی لباس میں بھی سنواری اس کی بیوی کو بھی اور چھٹی نشست پر بیٹھے اس کے دونوں بیٹوں کو بھی جو اسی کے چھٹی عمر کے لگے رہے تھے۔

اس نے ان کی تہیں میں دو سر کو شیلی بھی دیکھی تھیں جو وہ اسے اور اس کے باپ کو دیکھ کر سترخانہ انداز میں کر رہے تھے۔ سب اس کا باپ تھو کر لاکھڑا کر زمین پر گر کر اسے اپنے باپ سے زیادہ محروم بن دوں لوگوں کے تھوڑے کو دیکھا تھا۔

قیمتی لباس پہنے وہ دونوں لڑکے میر پر ہنس رہے تھے! اس کے باپ پر ہنس رہے تھے۔ اس نے اپنی جگہ جگہ پہنی تھیں کی طرف دیکھا۔ لڑکا بازار سے خریدی ہوئی

سستی کی پینٹ کی طرف دیکھا اور اپنی مٹلیاں چپلوں کی طرف دیکھا جن پر سوئی سے اتنی بار سلائی گواہی جاچکی تھی کہ اب کوئی کڑا بھی مشکل تھا۔ اس رات اس سڑک پر گھومے ہو کر اس کا دل چاہا زمین پر پڑے اور وہ اس میں جا جائے۔ قیدیوں کی طرح اس کا لباس تھے گھر گھر جھپٹا گئے لے جا رہا تھا۔ اس کے واسطے وہ اس کی مٹلیاں کے معصوم شکل دکھا کر لوگوں سے تیز رفتاری سے گزرتا تھا۔ اس کی دل چاہت تھا کہ زمین پر بے سدھ گرے اور روئے ہوئے اپنے باپ سے اسے غرت محسوس ہوئی۔ شہید غرت ہے! انتہا غرت۔ باپ کے جسم سے برساتا خون دیکھ کر بھی اسے اس پر ترس نہ آیا۔

محبت باقیانہ اور جونی خیلات اس کے دل میں آ رہے تھے۔ جو آوی اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ انہیں دھمکانے میں لے رہا تھا وہ اس سے اس کی ہر چیز بچیں لے۔ اس کی کانیاں گھر فکڑیاں نہیں ساری رات وہ اس سے سب کچھ بچیں لے۔ زمین پر گرے اپنے باپ کو اٹھانے وہ آگے نہیں بڑھا۔ اس نے سارا دینے کو اپنے باپ کے ساتھ اپنا ہاتھ نہیں بڑھایا۔ اس نے اسے زمین پر پڑا رہنے دیا۔

وہ سوچ رہا تھا وہ گاڑی میں بیٹھ کر ایسی جگہوں سے گھومتا ہے تو کیا وہ آسمان سے اترا تھا نہیں۔ اس کے پاس دولت اس لیے بھی کیونکہ اس نے اس کے حصوں کے لیے کو شیش کی جھین ممت کی تھی۔ اس نے رضا عرفان کی طرح تقدیر پر شاکر ہو کر صاحب لوگوں کے لیے چاہنے مانگے اور فاقوں اور حیرت جاتے جاتے اپنی زندگی نہیں گواہی تھی۔ اگر وہ ڈبل کیا جا رہا تھا تو خود اپنی وجہ سے اس کے پاس دولت ہوئی۔ رتبہ ہو تا تو لوگ اسے انسانوں کی طرح ٹیٹ کرتے۔ جانوروں کی طرح نہیں۔

صبح کے قریب نہیں جا کر اس کی ماں مہرالی تھی۔ ساری رات بڑبڑاتی ہوئی مشکلوں سے صبح سویرے اس کا دم ٹھکا تھا۔ پتا نہیں اس کا باپ اور بڑا بھائی اس موت پر دیکھیں رہے تھے۔ لم تر آدمی کی آنکھوں سے تو ایک آنسو بھی نہیں ٹپکا تھا۔ وہ سب جانتے تھے کہ وہ مر رہی ہے۔ وہ مرنے والی ہے۔ اگر ان میں اس کے لیے کچھ کر سکتے ہیں، بہت ہوئی تو وہ اسے بچا لیتے۔ یہ ہے کسی سے یہ سب گنت اپنے باپ سے اسے ایسی شدید غرت ہو رہی تھی کہ وہ انھوں میں اس کا اظہار کر ہی نہیں سکتا تھا۔

اب اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ بہت تیز اور تیز کر تیز کر کہ اس کی رفتار تک پہنچنا کسی دوسرے انسان کی بات نہ رہے۔ وہ رضا عرفان کا بیٹا ضرور تھا۔ وہ کچھ حاصل کرے گا چاہے جس طرح بھی۔ رضا عرفان کی بی بی کا شکار ہو کر وہ ماں بعد مر گیا۔ اس کے مرنے پر کوئی غم نہیں ہوا تھا۔ باں کی بی بی مرنے کا غم ضرور چند سالوں تک اس کے ساتھ رہا۔ اس نے خود کو یہ کہہ کر اس غم کو دل سے دور کیا تھا۔ پھر اس کمزور اور بیمار موت نے آخر کار مرنا تو اس کی اور کسمپرسی کے ساتھ تھا۔ بھوک، غم، تیز رفتاری، سلا، دامیوں کے ہاتھوں پر ہونے والے بیچہ۔ رضا عرفان جیسے شہر کی اس بھوری و آج بھلا خرابی اور ناخوشی وہ تعلیم حاصل کرنا رہا۔ وہ اپنی زندگی کو سزا دینے کی جدوجہد کرتا۔ جو اور رضا اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کی تعلیمی اخراجات کے لیے وہ اسے پیسے دیا کرتا تھا۔ اس کی کو دیر کا روبرو کہ میں خطا تھا مگر وہ اپنے سے بڑے بھونے بھولنے کو اپنے بیٹے کی طرح سمجھتا تھا۔ یہ خود کو اپنی مولیٰ تو کیا اس کے اپنے تعلیمی اخراجات پر دے سکتا تھا۔

کو شیش کرنا تھا کچھ ہی تھا کہ نوادے کے لیے جھپٹ لیا۔ وہ اکیلا اپنا خرچ خود نہیں اٹھا سکتا تھا۔ جو اور اس کی خدمت سے بہت خوش ہو رہا تھا۔ وہ خود نہیں پڑھ سکا۔ تم اس کی چھوٹا بھائی تو اعلیٰ تعلیم حاصل کر لے۔ جو اور رضا کے حالات کوئی بہت قابل رشک نہیں تھے۔ وہ رضا عرفان سے بہتر زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے بچے تعلیم بھی حاصل کر رہے تھے اور انہیں تینوں وقت کھانا بھی ملتا تھا۔ چاہے روکھا سوکھا اور عام سا کھانا ہی مگر وہ جو اور جونی کی طرح بھوکے پیٹ نہیں سوتے تھے۔

اسے پھر بھی اپنے بھائی پر ترس آتا تھا۔ کتنے غریب خوش خوشی وہ یہ پیسے جو بڑو کر خرچ کرنے والی غرت بھری زندگی ہی رہا تھا؟ رضا عرفان کی طرح کنویں کا مینڈک۔ ایک روز دنیا اسے بھی روکنی آگے بڑھ جائے گی۔ اس دنیا میں صرف اس کی عزت ہے جس کے پاس دولت ہے۔ حیثیت ہے۔ دولت سے کچھ نہیں آتا۔ اس کی یہاں تک کہ رشتے جاتے بھی خریدے جاسکتے ہیں اور دولت نہ ہونے پر گناہ بھی جاسکتے ہیں۔

اس کی بھابی کو بھی اس کی ماں کی طرح بچوں کی فوج

کے کسے کا شوق تھا۔ بڑو دھائی سال بعد آنے والے لوگوں سے وہ بڑا بڑا تھا۔ اسے اس بچوں سے بڑبڑا تھا۔ انہیں ڈھنگ کی بڑبڑنے کی جگہ تک نہیں ملتی تھی پھر اس مسئلے کا حل اس نے غلام عباس سے دیا۔ اس نے لکھا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع تھا جب اس نے اس کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا تھا۔ وہ اپنے کسی بھائی کے ساتھ بات نہ کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ ان میں کوئی اس کے معیار کے مطابق نہیں تھا مگر غلام عباس اسے دوستی کرتی پڑی۔ اس میں اس کا اپنا مفاد پوشیدہ تھا۔ غلام عباس کے باپ کی پرانی کتابوں کی دکان تھی۔ وہاں بیکند پینڈ پینڈ نہیں خریدنے آتے تھے۔ میر کے ہاتھ جو بھی بیٹے وہ کسی شاندار لائبریری میں مفت ملنے کے لیے جاتا۔ وہ بغیر کسی خرچے کے وہاں اسے خدمات سی اپنی اور ایسی کتابوں سے استفادہ کا موقع ملتا تھا۔

پینڈ پینڈ خریدنا بھی اس کی استطاعت سے باہر نہیں آتی تھی۔ اس کی کتابوں کا مطالعہ کر کے ہی اس نے انگریزی کو سمجھ لیا تھا۔ بہترین کتابوں کے ذریعے اپنے بے مضامین کے لوگوں کو دیکھنا کہ اپنے سرکاری اسکول کے استاد کے ایسے لوگوں بھی اس کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔ انہوں نے خود کر کے غلام عباس کو رات دن لکھ کر دے رکھنے پر مجبور کر دیا۔ غلام عباس اپنے اور بچے کے لیے کہہ سکتا تھا۔ آنا اور پھر کھانا کھا کر وہاں بند کر کے زمین پر لیٹ کر سو جاتا اور میر ساری رات لکھ کر رہتا تھا۔

وہ بھوک میں تھا۔ اب اس نے ایک لاسٹ فوڈ خرچت میں نوکری کر لی۔ وہاں کے مالک ایک انگریز تھا جو بیٹے۔ وہ ریپورٹ ایک منٹ کے ترس جاتے تھے۔ وہاں آنے والے تمام افراد اپنے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس نے وہاں بہت مقصد نوکری نہیں کی تھی۔

جہاں تھا وہاں کس کس کا اس کے افراد آتے ہیں۔ اس کا مطالعہ غیر معمولی طور پر تیز تھا۔ وہ وہاں آنے والے ہر شخص کو مر کے اسے جیتنے اور کھانے پینے کے انداز کو دیکھ کر اپنی نظروں میں رکھتا تھا۔ جو مرنے سے پہلے اچھا لگ رہا ہے اس نے لپاس کیا۔ یہاں سے وہ ہول سن طرح رہا۔ وہ خود کو کس طرح رہا ہے۔ وہ خود کو کس طرح رہا ہے۔ وہ ان تمام چیزوں کو دیکھنے کی کوشش کرتا تھا جو اسے آنے چاہیے تھے۔ اپنے لپٹے پڑنے میں

انہیں انگریزی کو وہ اپنے انگریز مالکوں اور وہاں آنے والے غیر ملکی افراد کے اریلے ہوئے تھے۔ انہیں بھی اچھا پڑا رہا تھا۔ وہاں صرف ایک سال کام کرنے ہی سے اس نے اپنی انگریزی کو ایسا بنا لیا تھا جیسے کسی کا بیٹا ہو رہا ہو۔ میرک میں اس نے وہاں میں پوزیشن کی تھی اور شہر کے سب سے بہترین کالج میں میرٹ پر اس کا داخلہ ہوا تھا۔

اب وہ اس پرستار اور کھانا سرکاری اسکول کی فضا سے نکل آیا تھا۔ اب اس کے استاد بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور اس بہترین کالج میں آنے والے تمام لوگ بھی اچھے اچھے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔

پڑھنے کے فطری تھیں کیا بااے اور تھیں اے کس چڑا کا نام ہے۔ جو اور رضا میں جانتا تھا پھر بھی اسے اتنا ضرور سمجھ میں آتا تھا کہ اس کا بھائی کسی بہت اچھی جگہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ مگر اس اعلیٰ تعلیم کے حصول کے ساتھ ہی حیرت بھلی کے اس گھر کو چھوڑنے کی بھی بات کی۔ اس سے وہ بھلا گیا۔ اپنا گھر ہوتے چھوٹا بھائی نہیں اور کیوں جا کر رہے۔ اس نے میر کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر اسے رخصتا ہی نہیں۔

اسے قائل کرتے اس کی آنکھوں میں آنسو تک آگئے۔ مگر وہ انہوں اس کے دل پر اثر نہ کر سکا۔ اپنی ذات کے لیے خود سارا خود غرض اگر انسان ہو جائے تو اس میں کوئی پرانی نہیں بچ رہی تھی تھا کہ جو اور رضا ان اس سے محبت کر رہا تھا۔ بہت بھائی ہونے کی حقیقت سے اس نے اسکول کے دنوں میں اسے مالی تعاون فراہم کیا تھا تو اپنی مرضی سے۔ میر نے خود تو بھی اس کے سامنے ہاتھ نہیں چھلایا تھا۔ باں جب وہ اس کے اخراجات کے لیے رقم مانگا تو بھی لینے سے انکار نہیں کیا تھا۔ غلام عباس کو میرک کے بعد اور جو اور رضا کو ان کے بعد اس نے اپنی زندگی سے باہر کر دیا تھا۔ وہ اپنے بچے اور سوتلوں کے ساتھ ایک کمرے کا قلیت نیز کر رہا تھا۔ اس کے پاس ذہانت تھی۔ ملازمین جس قابلیت تھی اور زندگی میں بہت کچھ کر کھائے کا عزم۔ آتی بی بی اس کے ساتھ پڑنے والوں کی اکثریت کو اپنے طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ جو چند مل گاؤں کے استاد تھے وہاں تھے بھی تو ان سے وہ کئی اور راہور ہم اس نے بھی نہیں بڑھائی۔ اس کے تمام دوست امیر گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ خود اپنا اپنی ایک گرافٹ کسی کو نہیں جتا تھا۔ سوال اس کے کہ اس کے بچے جس کی ذہن

ہو چلی ہے اور وہ اپنے بھائی بھابھی کے ساتھ رہنے کے بجائے دو ستروں کے ساتھ ٹیٹر کرتا ہے۔ ایم بی اے کر لیا اس کے خوابوں کی تکمیل نہیں بلکہ وہ پہلا قدم تھا جو اسے اس کے خوابوں کی زندگی کی طرف لے جانے کے لیے اٹھا تھا۔

اس کا ایم بی اے ہو گیا فارن بینک میں جاب مل گئی۔ ایک کمرشل ایریا میں ایک کمرے کے فلیٹ سے نکل کر وہ ایک ہسٹربانسی علاقے میں دو کمروں کے فلیٹ میں منتقل ہو گیا جسے وہ کسی کے ساتھ ٹیٹر نہیں کرتا تھا۔ پچھلے فلیٹ سے چاہے وہ بہت اچھا تھا مگر پھر بھی وہ فلیٹ اور وہ علاقہ اس کے معیار کے مطابق ہرگز نہیں تھا مگر مشکل یہ تھی کہ اس سے بہتر علاقے میں اپنا کمرٹہ لی الحال وہ فوراً نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس کے کیریئر کی ابتدا تھی۔ ایک دم سب کچھ کیسے تبانا؟ کتنے مہینوں تک بچت کر کے اور اپنی جمع کی ہوئی ساری رقم خرچ کرنے کے بعد تو کہیں جا کر وہ ایک گاڑی خرید پایا تھا۔

اپنی جاب کی ابتدا ہی میں وہ وہاں اپنی قابلیت کو بڑی آسانی سے سب سے تسلیم کروا چکا تھا مگر اس کے باوجود بھی ابھی زندگی اس جگہ نہیں پہنچی تھی جہاں وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا پھر اسے وہ ملی۔ ماما احمد علی۔ خوبصورت ایسی کہ اس پر سے نگاہیں ہٹانے کو جی نہ چاہے اور زمین ایسی کہ اس کی مصحفو خاموشی سے سنے بغیر رہا نہ جائے۔ وہ خوبصورتی اور نہایت کا بڑا حسین استرجاع تھی۔ فورتحہ میسمنر کی اسٹوڈنٹس جو غلط پاپ ایم بی اے کر کے آئی تھیں اسے پاس آؤٹ کرنے والی تھی۔

اس لڑکی کا پرو فیشنل کیریئر کتنا شاندار ہو گا؟ وہ اس سے پہلے ملاقات میں اس کی ذہانت اور قابلیت کو جاننے کے بعد بہت اچھی طرح اندازہ لگا سکتا تھا۔ اس کے اندازے کم ہی غلط ثابت ہوتے تھے اور ماما احمد علی اس کے اندازوں کے حساب سے ایک ذہین، قابل، اچھی عادات اور اچھے مزاج کی حامل لڑکی تھی۔ اے ماما احمد علی سے اس پہلی ملاقات میں ہی محبت ہوئی تھی۔ "میری محبت۔۔۔ تمام فائدے نقصان سوچنے سمجھنے اور اچھائیاں برائیاں جانچ لینے کے بعد ہونے والی محبت۔"

وہ چاہتا تھا کہ وہ جس سے شادی کرے وہ اسی کی طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ اور شاندار کیریئر رکھنے والی لڑکی ہو تاکہ دونوں مل کر وہی زندگی گزار سکیں جیسی زندگی وہ گزارنا چاہتا تھا۔

ایک ایسی لڑکی جو اس قابل ہو کہ اس کے ساتھ قدم ملا کر چلے اور زندگی کو خوبصورت سے بنائے۔ بنانے میں اس کے شانہ بشانہ کام کرے مگر وہ یہ سمجھتی تھی کہ ایک کمزور فیملی بیک گراؤنڈ کے ساتھ اس کی فیملی کی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی کا مل جانا خاصا مشکل ہے۔

ماما کو کہ اپنے لباس سے ملن کلاس گھرا ہے کی آری تھی مگر پھر بھی وہ یہ سوچ کر ڈر رہا تھا کہ کونسی گھر والے اس رشتے سے انکار نہ کریں۔ کونسی اسے اٹھا کر اپنی بیٹی نہیں دے دے گا۔ اس کے پوری چھان بین کی جانے لگی۔ غربت بھرے۔ ایک چڑھائی کا بیٹا اور ایک جاہل عناد اور غریب بھائی۔ دوستی کی بات دوسری ہے مگر شادی پیام کے میں لوگ حسب نسب اور خاندان کو کس قدر رائے ہیں وہ اچھی طرح جانتا تھا مگر وہ لڑکی تو جیسے ملی ہی اس کے مسائل کے حل کے لیے تھی۔ اس کی ماں کو کوئی اتار کر پھینکنے کی اتنی جلدی تھی کہ اس نے دوسری کے طور پر بھی حیر کے بارے میں کچھ جاننے کی نہیں کی تھی۔ اس کی ماما کے ساتھ شادی طے ہو گئی۔ اب وہ لڑکی اس کی زندگی میں آنے والی تھی جسے اس ساتھ مل کر معاشی میدان میں سرگرم عمل ہونا تھا اور اس کو خوبصورت بنانے میں اس کی مدد کرنا تھی۔

اس نے تارن طے ہوتے ہی پہلی فرصت میں اس علاقے میں کرائے کا اپنا کمرٹہ لے لیا اجال رہتا اس زیرین خواب تھا۔

وہ ماما کو بیاہ کر اپنے ساتھ لے آیا وہ اس کے ساتھ بہت خوش تھا۔ اس کا ساتھ اسے اس کے خوابوں کے نزدیک جو کر رہا تھا لیکن وہ ماما احمد علی وہ تو بالکل پائیل تھی وہ کہہ رہی تھی کہ وہ جاب نہیں کرے گی۔ وہ کچھ اس کی خدمت میں کرے گی۔ اس کے منہ سے جاب انکار سن کر وہ بوکھلا گیا۔ اس نے ایک ایم بی اے کی لڑکی سے کیا اس لیے شادی کی تھی کہ وہ کچھ بڑھ کر اس سے اس کی کمائی اڑائے اس کے لیے بیسویں پر اسے کرے اس کی کمائی سے گھر کے سارے اخراجات بنانا خود کو ایک سکھ اور مشتاقی پوری سمجھے۔ وہ ماما احمد علی کو اس لیے ایک بوجھ بنا کر نہیں بلکہ مل جل کر بوجھ اٹھانے والی کر لایا تھا اور وہ اس پر بوجھ بننے کی بات کر رہی تھی۔ کہہ کر وہ اسے جاب کے لیے قابل کر سکا اور نہ اس کے

نے تو اس کے اوسان ہی خطا کر دیے تھے۔ جس جگہ پر وہنا
 وہ کیا اور نہیں کر سکا تھا وہاں کے عقلموں سے آرام
 سے رہتے تھے۔ اس نے ہمارا کھانا کھانے اور خیرات کس
 طرح ہاتھ میں نہیں سمجھا تھا وہ واقعی زمین لگی تھی۔
 اس کے سمجھانے بغیر کبھی تھی کہ اس کو کن چیزوں
 کا خرچہ چاہئے نہ لینا ہے۔ پورے اہلکار اور عدل سے وہ
 دونوں ہی کر پاتے تھے۔ اگرچہ چارہ دے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ
 بہت خوش تھا۔ وہ بالکل دیکھی ہوئی تھی جیسی ہوئی اسے
 چاہیے تھی اور وہ محبت اس سے اتنی واہمان کرتی تھی کہ
 بغیر ہر گز اس کی محبت کی شدت پر حیران مارہ جاتا تھا۔
 وہ بہت بات بگڑی تھی اختلاف کے تسلیم کرنا تھا کہ ان میں اگر
 بھی کوئی لڑائی ہو تو اس کے سر پر ہونی چاہیے۔ وہ
 ہے۔ وہ اس کی محبت سے اختلاف کرنا ہی نہیں سمجھتی
 تھی۔ وہ اس کے ہاتھ اور منہ پر ہوا اور بھی
 نہیں بھی ہوئے۔ یہی حال اس وقت ہو تا جب وہ اس کی
 خدمت کرتی اس کے سامنے کام ہوتی گئیں۔ اسے انعام
 دیتی۔ شادی کے ابتدائی دنوں سے ہی اس نے خود ہی حیر
 کے سامنے کام اپنے ذمہ لے لیے تھے اور وہ اس سے
 اپنے کام کرانے کا بہت تہمت خاوی بھی ہو گیا تھا۔ وہ
 صرف معاشی میدان میں اس کی ہم قدم نہ تھی۔ کھیل
 اور کی انعام دینے کے لحاظ سے بھی وہ ایک بہترین بیوی
 ثابت ہوئی تھی۔

بھی وہ اس کی خدمتوں سے بہت متاثر ہو تا اور بھی یہ
 سوچ کر بہت ناز ہو جا کہ ہمارا اپنی خدمت اور اپنی محبت کا
 سبب یہ ہے کہ وہ ہے۔ اسرار اور وارث ہے۔ میرے سوا
 اس کا اور کوئی اسرار نہیں۔ ایک بیٹی ہی سوچ اس کے
 اندر ابھرتی ہے۔ اس کا عقلموں اور اس سے متاثر ہونے سے
 روک دیتی۔ یہ غرض نہیں اور یہ ہمیں نظریہ ضرورت کے
 تحت ہیں۔ ہم غفلت کا شکار اور وارث اور خیر لڑکی۔ اگر
 اس سے محبت نہیں جانتے گی تو آخر جانے کی کہیں؟ جو
 ایک رشتہ اسے حیرت کی صورت ملا ہے۔ محفوظ فراہم کرنے
 کو۔ ظاہر ہے اسے وہ کسی بھی قیمت پر کھانا نہیں چاہتی
 تھی۔

بھی اگر اسے معمولی ہمارا یا نظر کھائی ہی ہو جاتا تو وہ
 اس کی تبادوری اور خدمت میں دن رات ایک کرتی۔
 اسے ہر مل اس کی محبت کی فکر رہتی۔ اسے لگا کہ کام کی
 دھن میں وہ اپنی محبت سے غفلت برتا ہے۔ یہ احساس

مل میں رکھنے کے باوجود کہ وہ اس سے اپنی محبت اس لیے
 جانتی ہے کہ اس کے سوا اس کا دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔
 پھر بھی اس کی محبت اور دانہ نہ ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ
 کے نیچے بھی غلط محبت نہیں ہوتے۔ لوگوں کے عقلموں
 اس کی ابتدائی دانتے ہوش سو فیصد درست ثابت ہوئی
 تھی۔ ہمارا اس کا بہترین انتخاب تھی۔

وہ اس کے ایک دو بچوں کی ماں بھی بنی باقی اور اس
 بندہ یا میں سالوں بعد وہ دونوں مل کر اپنا وہ خواب
 بھی پاتا تھے جس کے ان دونوں نے مل کر ہی خواب
 تھے۔ مگر ان تمام ممکنات کی راہ میں سدرہ خلیج آتی۔ وہ
 سے پہلی طاقت کے ابتدائی عقلموں میں ہی اس کی محبت
 میں جتا ہو گئی تھی اور میرے اس کے باپ کے عقلموں
 اثر و سونے کی محبت میں ہرگز نہ ہونے کے ساتھ وہ اس
 کے قریب اتنی باری تھی اور وہ اسے خود سے دور اس
 کے بجائے مزید قریب آنے کا موقع دے رہا تھا۔ اس کی
 اور اس تعلیق کی پہل اگر سدرہ کی جانب سے ہوئی تھی
 اس میں مزید بے تعلقی اور قہر پیدا کرنے میں اس کی
 کو خشوں کا بھی پورا پورا مل تھا۔ وہ ایسا یوں کر رہا۔
 اس کے اپنے اندر جنگ ہی پھڑپھاتی۔ وہ اس لڑکی کو
 سے دور کیوں نہیں کر دیتا اسے صاف صاف یہ کیوں نہیں
 قہار تھا کہ وہ ایک خوشگوار شادی شدہ زندگی گزار رہا ہے
 خوشگوار زندگی؟

کہاں ہے زندگی خوشگوار؟ خوشگوار زندگی ہے کہ وہ
 ایک دیکھوں کے لپار محبت میں گرایہ پر رہتا ہے۔ اپنی
 پسند کا لڑی خریدتا تو اس کی استطاعت سے بے بہرہ ہے۔
 خوشگوار زندگی ہے کہ جس گھر کا اس نے دس سال کی عمر
 میں خواب دیکھا تھا وہ اسے آجندہ دس سالوں بعد ذہنی اور
 میں نصیب ہو گا؟ اس کی خواب جو ملا سیت بہت
 لوگوں کو قہر و شک ہوتی ہے اس کی اپنی کھول میں وہ
 بھی سر سے پہنی ہی نہیں۔ بس ایک مجبوری کا
 ہے۔

حیرت شائے اللہ نے ایسا ہی اور ایسی قابلیت ملی ہے
 کہ وہ ایک دن میں ان کو ملے کہ کوئی روئے نہ کر سکا
 ہے۔ پورے ایک ماہ دن رات محبت کر کے بھی وہ کچھ نہیں
 نہیں کیا۔ وہ ایک لڑکی سدرہ خلیج اگر اس کی زندگی میں
 شامل ہو جائے تو وہ کہاں سے کہاں جائیگا۔ سدرہ کی
 قدموں کا اگر وہ العانہ انداز میں پرتپاک خیر مقدم کر رہا تھا

عین ہمارا محبتیں اور غم میں اسے الجھا رہی تھیں۔
 ان دنوں اس کی خدمتوں پر خوش ہونے اور خوش
 کرنے کے بجائے وہ اپنے لگا تھا پھر یہ الجھن اس کے
 حواس سے بھی جھٹکتی تھی۔ وہ اسے کیا کہہ چکے تھے؟
 اس کے ساتھ اتنی اچھی ہے لیکن وہ ان اچھا نہیں کا کیا
 کے کہ یہ اچھا یاں اسے وہ زندگی میں دے سکتیں
 ہی زندگی وہ دینا چاہتا ہے۔

سدرہ سے شادی کر لی تو ہمارا کھانا وہ تو بالکل اسکی
 جھلے گی۔ اس کے سوا اس کا کوئی بھی نہیں ہے۔ وہ کیا
 صرف اس کے اپنے خوابوں کی زندگی میں ہے۔ وہ کیا
 اس زندگی کی طرف بڑھنے سے ملنا نہیں رہ جائے گی۔
 اس کے ساتھ سے نکل گیا تو پھر شے بچتا نہ رہتا۔ ہمارا لڑکی وہ
 کے کہ اسے اسے اس اختیار ذیل کے ساتھ ہے
 لیکن وہ ہائے کی کہیں؟ وہ واقعی دینا نہیں چاہتا ہے۔
 پر بھی لکھی ہوئی ہے۔ منجملہ کی خوب۔

اس کے اپنے اندر سوا خواب ہوتے۔ اس فیصلے کے
 اس میں اور خلافت میں دونوں طرح لالچ لے رہا ہے۔ وہ
 اس دونوں ایک الجھنوں میں گرفتار تھا کہ یک دم کوئی بھی
 مل کر کہیں اس کے لیے بائیں محبت ہو رہا تھا۔ اس کی یہ
 نہیں ہوا۔ اس کا وہ بچ کر رہی تھی وہ خود بخود کسی
 ہی معمولی بات پر جھگڑا شروع کر دیتا۔

مگر وہ تو اس کی تعلیم کے جواب میں پہلے سے بھی زیادہ
 دم ہو گئی تھی۔ بہت تلاش اور کوشش کے باوجود بھی
 اب اسے سمجھنے کی کوئی عقل و جاہ اسے نہیں ملی تو
 گھر کا اس نے کیے گھر کے بغیر کسی وجہ سے ہی
 کر دیتا۔

سدرہ کو بھی یہی ملتی اسے زندگی میں پھر بھی نہیں ملتی
 اور وہ زندگی میں پہچانتا نہیں چاہتا اور پہلے اسے اس
 کے لیے افسوس ہے وہ اسے تو تھی سے نہیں چھوڑ رہا۔ وہ
 کو یہ سب کچھ ہائے کا محبت اچھی طرح دیکھتے تھے
 اس کے سونے کے سے انداز میں۔ وہ اس کا دل نہ کھینچے پر اس
 سے معذرت بھی کر لے گا۔

مگر اس کے بہت اچھے انداز اور نرم لہجے کے باوجود بھی
 اس بات پر ہمارا کار عمل پاگل ہی اور جنوں سے بھرا ہوا
 تھا اس سے کتنی مشکل سے پہچان چکا تھا۔ اس کا دل
 چاہتا تھا۔ سدرہ سے شادی کے کافی عرصے بعد اس نے
 اسے طلاق کی بات کرنے کے لیے فون کیا۔ تب تو رونا

پہنچا چکا کہ اس نے اسے کام کی بات کر دی نہیں دی
 تھی۔ اب وہ یہ اہم ترین بات کرنا چاہتا تھا۔ ہمارا امر علی
 واقعی خوداری اور عزت کسی سے نا آشنا تھی۔ وہ اس سے
 طلاق لینے سے انکار کر رہی تھی۔



سدرہ نے اسے اپنے پرکھنے ہونے کی خبر ملی تو
 اس خبر کوئی خاص خوشی محسوس نہ کرنے کے باوجود اس
 نے معمولی خوشی کا اظہار کیا۔ سدرہ چاہتی تھی کہ کسی
 پیدائش کرانی میں ہو۔ اس موقع پر وہ اپنی محبت کو اپنے
 قریب رکھنا چاہتی تھی اور وہ باری کی وجہ سے امریکہ
 نہیں نکلتی تھی۔ سدرہ کافی پہلے کر اپنی ملی تھی جبکہ
 وہ پرکھنے کے آخری دنوں میں اپنے بہت سے کام
 چھوڑ کر وہاں جانے پر صرف اس وجہ سے مجبور ہوا تھا کہ
 اس کی غیر موجودگی پر وہ غماض تھا بھی اور ہر فون کل میں
 اس خلیج کا اظہار کر رہی تھی۔ وہ ابھی اپنے ذاکریت میں
 مصروف تھا اور بھی کسی طرح کے اہم ترین کاموں میں اس
 نے خود کو مصروف رکھا تھا۔ اس کے لیے اس کا گھر دنیا
 کے ہر شے سے زیادہ اہم تھا۔ یہی بات کہ سدرہ کو اتفاق
 گوارا اس کے کارکن رہا۔ بالکل نہیں لے سکا تھا۔

ہمارا بھی اسے ایک دکان میں ملی تو اسے دیکھ کر
 اسے صرف یہ خوف لاحق ہوا کہ سدرہ کے سامنے اس
 کے پاس انکس کی منتیں نہ کرنے گئے۔ اسے اپنے پاس
 واپس ہانپنے کے لیے احتجاج نہ کرنے گئے۔ پانچ نہیں غم
 خلیج کی بیٹی تھی اس سے نفرت کرنے کے بجائے وہ ابھی
 بھی اس کی محبت میں جھٹا تھی۔ اس میں ابھی بھی نہیں۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے اس کی
 واقعی کی دل دیاں سے شکر تھی۔

سدرہ اس کے نام سے بھی غار کھاتی تھی۔ اگر وہ اس
 اپنی توانائی طور پر سدرہ کا موڈ بھانے کا لیکن ہنگر
 تھا کہ وہ اس کی تھی نہیں تھی۔ ہاں اس کے دل سے ضرور
 شاد کے اظہار کا اہوار بھانے کچھ طر کرنے کی کوشش کی
 تھی۔

اگر وہ باپ ہی رہا تھا تو اسے اپنے باپ بنا تھا مگر
 قسمت نے یہاں اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ اسے بیٹی کی
 کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی مگر صرف سدرہ کی وجہ سے اس
 نے معمولی خوشی کا اظہار کیا اور جبکہ کرکٹ میں لیٹی اپنی

اور باب ادا کی اور منڈے کو بھی کچھ کر لیا کروں گی۔
میں اب جس ہال میں بھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔
میں تمہاری بہت باتوں کی۔"

ای میل لکھ کر جلد سے جلد حاصل کر لینے کی دھن
میں اسے ہموں ڈالتا۔ اسے خواہی گھر کو حاصل کرنے کے
لیے اس سے مزید محنت اور پیسے سے بھی زیادہ کام کرنے کا
اعدہ کر رہی تھی۔

"تمہیں یقین بھی نہیں آئے گا کہ ماہاتی محنت کر سکتی
ہے۔ میں تمہیں اتنی محنت کر کے دکھاؤں گی۔" اسے کوئی
کوڑے مار رہا تھا، بہت زور زور سے۔ اس کا پورا وجود خمی
اور لوہمان ہو رہا تھا۔ وہ سسک رہا تھا اور تڑپ رہا تھا۔

دھاتی سالوں میں اسے خود بھی خبر نہ ہو پائی کہ کب اس
کی Calculated محبت غیر مشروط محبت میں بدل گئی۔ ہر

سور و زباں سے بے نیاز ہر بے لطف نقصان سے بے پروا۔ حیر
رضا کا دل محبت کے جذبے سے بھی آشنا ہے کہ اسے یہ
بیمانی ایک بیمار بھرا دل رکھنے والی، مجبور اور اندھا بین
رکھنے والی لڑکی نے دی تھی۔ کبھی اس کی دل کو اہمیت دی
ہوتی اس کی دھڑکنوں کو لمحہ بھر کے لیے ہی توجہ سے سنا
ہو آتا تو پتا چلتا بھی کہ اس دل میں وہ کسی چیز پر خود بخود پس
گئی ہے۔ ماما کو چھوڑتے وقت جو کشمکش تھی جو بے چینی
اور ہوا بھن تھی، وہ اسی دل کے سبب تو تھی۔

اگر بید خوشی لاتا ہے تو پھر آج تو اسے دل و جان سے
خوش ہونا چاہیے۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ وہ شے کی کوشش
کرتا تو اندر لڑ پر قطرہ قطرہ آسو گرنے لگتے ہیں۔

"صرف محبت میرے لیے کافی نہیں۔" یہی لکھا تھا ناں
ماہات اس نے۔ صرف محبت؟ محبت کیا صرف ہوتی ہے؟

"تمہارے لیے یہ مذاق ہو گا مگر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی
مجھے چھانی کے لیے پرکھنے پر آمادہ کر رہا ہو۔ میں تمہارے
بغیر زندہ رہی نہیں سکتی۔"

وہ ہر رات اس کے پاس آتی۔ اس کے سینے پر سر رکھ کر
روتی۔ اسے اپنے سینے پر واقعی ایک بوجھ سا محسوس ہوتا
اپنی کہیں کسی کے آنسوؤں سے ٹپکتی ہوئی لگتی اور اپنے
ہاتھوں پر کسی کے لرزتے ہوئے ہاتھوں کی مضبوط گرفت

"میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی۔ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ
تو۔" یہ روتی ہوئی آواز تھی اس کا تعاقب کرتی
تھی۔ اسے ہر پہل میں لگتا جیسے وہ اپنے اپارٹمنٹ کے

دروازے سے اپنا سارا سامان لے کر باہر نکل رہا ہو۔ اور وہ
اس کے پیچھے بھاگ کر آتی اسے روک رہی ہو۔

جب اس روز وہ اس گھر سے چلا تھا تو صرف ماما ہی
نہیں چھوڑا تھا بلکہ اپنے بچوں کا ایک حصہ بیٹھ کے
وہاں چھوڑ آیا تھا۔ اپنے وجود کے اس کھوئے حصے کو اب
جانتا تھا، پورہ کھو جائے والا حصہ اسے کہیں پر بھی ملتا نہیں
تھا۔

"مجھ سے ناراض ہو کر سو گئے تو تمہیں نیند آجائے گی
؟"

"وہ رات میں لینے لینے اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ اسے سدرہ
سے جڑ ہونے لگتی، اسے سدرہ سے نفرت ہونے لگتی،
اسے اس کا وجود ناقابل برداشت لگنے لگتا۔ پھر وہ دبے پاؤں
اس کے خیالوں میں چلی آتی۔

وہ سدرہ اتفاق کے ساتھ شادی کے چار ساڑھے چار
سال تک بہت اچھا اور محبت کرنے والا شوہر بن کر رہا۔ مگر
پھر اس کا رویہ سدرہ کے ساتھ بدلنے لگا اور پھر ان کی شادی
شد و زندگی کے سچ اور اس کے بعد سترہ ترین دور کا آغاز ہوا۔
وہ سدرہ کو نظر انداز کرنے لگا، وہ اس کے ساتھ کہیں چنے،
کتنی اور وہ میرے پاس وقت نہیں سے کہہ کر صاف انکار
کر دیتا، وہ اسے تار کھیر اپنے مہمانوں کو انوارا ٹٹ کرتی اور
وہ مہمان کھانا کھا کر رخصت بھی ہو جاتے تب تک گھر
واپس نہ آتا۔ نتیجتاً وہ اس سے لڑتی، جھگڑا کرتی۔
سدرہ کو اس سے بہت ساری شکایتیں رہنے لگی تھیں۔ وہ
گھر کو ہوا ہی سمجھتا ہے جہاں وہ صرف سونے آتا ہے۔ وہ
پیشہ لکھنے کی ایسی ہوش میں جتا ہے کہ دولت اور اپنے
کیریر کے آگے اسے اپنی فیملی نظر ہی نہیں آتی۔

وہ ان شکایتوں کی پروا ہیوں کرتا، جبکہ وہ ان شکایتوں کو
پیدا ہی جان بوجھ کر کر رہا تھا۔ جب تک وہ چاہتا تھا کہ سدرہ
کو اس سے کوئی شکایت نہ ہو، تب تک اس نے اسے کوئی
شکایت نہیں ہونے دی تھی اور اب وہ چاہتا تھا کہ سدرہ کو
اس سے شکایت ہی شکایتیں ہوں۔ اسے اب سدرہ اتفاق
اور اس کے گلے شکایتوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔

اتفاق جمال سال بھر پہلے رٹا رہے ہو چکے تھے اور
رٹا رٹ منٹ کے بعد انہوں نے دوران کی بیوی نے مستحق
رہائش کے لیے کراچی کو منتقل کیا تھا۔ اسے رٹا رٹ
سے اسے نہ تو اب کوئی خطرہ تھا اور نہ ان کی کوئی ضرورت
تھی کہ وہ ان کی بیوی کی ناراضیوں سے خائف ہو آئے۔ بلکہ یہاں

تو یہ جی کہ وہ در پردہ چاہتا ہی تھا کہ سدودہ اس سے
ڈر جھو کر خود ہی اسے بھڑکاتا ہے۔ کئی مہینوں تک ان کے
درمیان لڑائی جھگڑوں کا سلسلہ جاری رہا۔
سدودہ جلیل صورت کی طرح اس پر چلائی اس سے لڑتی
اور وہ اسے ہلکا جھٹکا چھوڑ کر کھڑے کھل جاتا کر کھرہی
یو نا آوازے کرتے ہیں چلا جاتا اور اگر وہ کمرے میں آکر لڑتی
تو اسے نظر انداز کر کے سونے لیٹ جاتا۔ سدودہ نے غصے
میں الگ کمرے میں سنا شوخ کر دیا۔ اس کی محبت پر اس
سے کون سا فرق پڑتا تھا؟ انا وہ تو دل ہی دل میں خوش ہوا
تھا۔ ان دونوں کے لڑائی جھگڑوں اور سخت رویوں کا اثر اس پر
اوری زیادہ تھا۔ وہیں کو پہنچ چلا نا کچھ کر دے لگی تھی۔
اس کے رونے سے اسے غصہ تکلیف ہوتی۔ وہ بھی کی
پیدا کر کے چاہتے خوش نہیں ہوا تھا مگر اپنی بیٹی سے
اسے بہت پیار ہو گیا تھا۔ وہ چھوٹی سی لڑکی اپنی سن موٹی
امان اور بار بھری معصومانہ باتوں سے خود ہی باپ کے دل
میں اپنی محبت پیدا کر دیتی تھی۔ کئی مہینوں کے لڑائی
جھگڑوں کے بعد ایک رات سدودہ اس کے کمرے میں آئی
اور اسے اپنی اور اس کی لڑکھانہ روائی کی اطلاع دی۔
"میں بھی لڑائی کے پاس واپس جا رہی ہوں۔ بیٹھ کے
لے۔" اسے اٹھنے کوئی کے ساتھ ہرگز نہیں رہتا تھا۔ میری
کوئی پروا نہیں۔ اس کی زندگی میں میری کوئی اہمیت نہیں
تو میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی کبھی میرے ساتھ نہیں
ہو۔ تم سے شادی میری زندگی کا سب سے غلط فیصلہ
تھی۔ ایڈی تمہارے بارے میں درست خدشات کا اظہار
کرتے تھے۔ تب میں ان کی بات نہیں مانتی تھی۔ احسان
فراموش اور محسن کش انسان ہو۔ تم مجھ سے اپنا کبر
ہاتے اور دولت اٹھنے کرنے کے لیے شادی کی اور آج
جب سب کچھ حاصل کرنا تو مجھے چھوڑ کر واپس آیا۔ اما احمد
ملی کے پاس جانے کے بجائے تلاش کر رہے ہو۔ وہ
تمہاری ملل کلاس یونیورسٹی جو تمہارا سر اور تمہارے پاس
داتی تھی۔ تمہاری بیٹی حضور کی تھی۔ میں اپنی سادوں
میں تم میرے ساتھ تو ایک چل نہیں رہے۔ تم نے ہر مل
مجھ میں ایسی ہی شکل ڈھونڈی ہے۔ یہ دولت تو انہی کر رہی
ہیچے ہو۔ مگر اب شوق سے اسی کے پاس میں اور میری بیٹی
تمہاری زندگی سے نکل رہے ہیں۔"

مستند ہی صل ہو رہا تھا۔ بس مسئلہ اگر تھا تو اس 5۔ وہ اپنی
بیٹی کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ مگر یہ سدودہ 5۔ وہ اپنی
معاشرے میں اسے کس قدر دفع کر دینے کی اہمیت دیتی تھی
وہ جانا تھا۔ لیکن اس نے اس کے جانے پر کسی رد عمل
اظہار نہیں کیا۔
"سدودہ سے اس کو چھین لے کا چاہتے ہیں بھی
طرح بنانا اور اسے تھکانا پڑا ہے کہ وہ اس کے لیے سدودہ
بھی اپنی جان ثابت ہوگی۔ سدودہ لڑتی لڑتی گھر سے
رہم کر کم پر تو چھوڑ کر چلا ہے اس نے جی کو۔ یہاں اسے
بہت پیار سے پیٹتے تھے تازہ خیم میں بٹے کی۔ اس نے باپ
بارے میں بہت یقین سے سوچا۔
وہ ما کے پاس جانے لگا۔ وہ سکا۔ وہ خود ہی رست
ناراضی کا اظہار کرے۔ وہ اسے منانے لگا۔ وہ اس سے
معاذ بھی مانگ لے گا۔ اب جب اس کے پاس دولت
موجودہ تمام سب کچھ ہے تو بس صرف اس کی کمی ہے۔
کی روئے جانے پھر وہ اسے دل سے خوش ہو گا۔
اما اور وہ دونوں مل کر اپنے خوابوں کے کمرے میں رہیں گے
اور اس اہل جلی تو۔ اس اپنی اور اس کے ساتھ رہے گی۔
وہ اپنی بیٹی کو سدودہ کے پاس تو کسی قیمت پر نہیں چھوڑے
گا۔ وہ سدودہ کے اپنی زندگی سے نکلنے کے فوراً بعد ہی ما
کے پاس چلا جاتا چاہتا تھا۔
مگر اس کے جانے کے بعد اگلے عین ما اسے اس سبب
امریکہ میں کراؤ لے پاتے کہ اپنے پردیش کے حوالے
سے چند بہت اہم کام نکلنے کے ساتھ ساتھ اسے سول
فروری کا بھی اظہار تھا۔ وہ ما کے پاس واپس سول فروری
کے دن جانا چاہتا تھا۔ وہ یہ جان کر کتنی خوش ہوئی کہ میر
نے اس دن کو اسے اپنے پاس سے یاد رکھا ہوا ہے۔
ان تین ماہ میں اس نے سدودہ سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا
پان اہل سے ضرور وہ فون پر بات کیا کرتا تھا۔ انہیں نہیں
نے اسے سدودہ کے کراچی چھٹنے کے ایک دن بعد ہی فون کیا
تھا۔ وہ یقیناً "اسے خوب کھری کھری سناتا اور اسے دھمکا
چاہتے تھے۔ مگر اس نے ان کی فون کال مسترد کر دی تھی
کی تھی۔ وہ جانتا تھا جب تک سدودہ اور اس کی شادی
پر قرا ہے۔ اتفاق جمل مصلحتاً خاموش رہیں گے۔ میں
روز اس نے سدودہ کو طلاق دے دی پھر وہ اسے یاد رہا۔
کرنے کے لیے اپنے سادے وسایل تمام اثر و رسوخ اور
ساری طاقت استعمال کر دیا۔ اس کے۔ اسے اتفاق جمل کی

طاقت کا بالکل ٹھیک ٹھیک انداز تھا اور ان کی طاقت کے
دوران میں اپنی طاقت کا بھی۔ اس بوڑھے اور زخمی شیر
سے مقابلے کی جو صورت حال تقریباً اسے درپیش آئے
والی تھی وہ اس کے لیے گھر کو بہت سیلے سے بہت اچھی
طرح تیار کر دیا تھا۔ وہ وہاں تمام سال سے باطل خائف نہیں
تھا۔
میں روز روز کراچی جانے کے لیے جہاز میں سوار ہوا
اس کا دل اس کو مگر حقائق کی طرح اچھلنے اور چھلانگیں
دارنے کا جو ایک عرصہ کی بعد اپنی محبوب سے
ملنے والا ہے۔



شہم کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے جب ما کی بیکریٹری
اس سے پاس آئی۔
"سر اما سیر کا بھی فون آیا تھا۔ وہ بینک فتح ہونے
کے بعد نہیں واپس نہیں آئی تھی۔" وہ پچھلے چار گھنٹوں
سے اس کے کہیں میں بیٹا اس کی واپسی کا منتظر تھا۔
"اس نے کہا کہ" بھات بھینے والے انداز میں سر ہوا
وہ منتظر کر رہی ہے۔ اٹھائیں۔ وہ فون پر اوقات ختم ہونے پر
اپنی بیکریٹری اب یقیناً اپنے گھر واپسی کے لیے تیار
تھی۔ سب بیکریٹری کی اپنی پاس سے فون پر بات ہوئی تھی
تو پھر اس نے یقیناً "اسے یہی بتایا ہو گا کہ" "میں ابو
سب سے پہلے آپ سے ملنے کے لیے آئے بیٹھے ہیں وہ
ابھی بھی آپ کے کہیں میں موجود ہیں۔" اور یہ بات بھی
بیٹی اٹھ رہی تھی کہ ملائے لائی بیکریٹری کو میر کے متعلق
کچھ بات جاری نہیں کی تھی۔ اگر کہ وہ نہیں تو بیکریٹری
میر کو اس پر مبنی یہاں بیٹا چھوڑ کر بھی آجس سے نہ
جانی۔ وہ میر کو اپنی جگہ پر کر دینا دیکھ کر شائے پکا پکی
یقین سے باہر چلی گئی۔
اما واپس آئے۔ اسے لڑائی طور آتا ہے اس سے
معتفک کو ناخوش چھوڑ کر وہ بھی اپنے گھر میں جا سکتی۔ وہ ما
سے بات کیے بغیر سال سے ہرگز نہیں جاتے گا۔
کو وہ یہ توقع لے کر رہا نہیں تھا کہ ما اس کے
ساتھ اس طرح کا رونا کرے گی۔ لیکن اگر وہ ایسا کر رہی
تھی تو وہ اس صورت حال کا خدو پیدائشی سے سامنا کرے
گا۔ "میری بیٹی ہو گی اس کی ناراضگی؟ وہ اس سے اتنی بے
تجربہ محبت کرتی ہے کہ زیادہ تر تکیا اپنی ناراضگی پر قائم رہ

ی میں پائے گئے۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا۔ ہنس میں
لوگوں کا شور اور کالوں کی گھبراہٹ ختم ہوتی چلی جا رہی
تھی۔ سوسائٹ بیچے تو ہنس میں عمل سنا جھیل پڑا تھا۔
شاید اب کال کا ہی کوئی نوک ملے موجود تھے۔
اما کا کہیں عمل اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ وہ اسی
اندھیرے میں بیٹا رہا۔ اس نے اٹھ کر نیوٹ لائٹ آن
کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ساڑھے سات بجے اسے
تدہوں کی آہستہ آہستہ دی۔ کوئی کرڈر میں چل رہا تھا۔
وہ اس طرف ہوتے ایک ایک قدم کو اپنے دل سے دم
آہستہ بار بار تھا۔ یہ کون ترہا تھا۔ اس کا دل جاتا تھا۔ چند
منٹوں بعد اس نے دروازہ کھلے کی نواز سن۔ اندر قدم
رہتے ہی اس نے سوچ کر مارتی تھی سے ہاتھ چلاتے تمام
لائٹس کن کر دی تھیں۔ یک دم ہی کمرہ رو شنی میں نہ آیا
اور وہ اتنے گھنٹوں سے اندھیرے میں بیٹھے رہنے کے سبب
یک دم رو شنی ہو جانے پر فوراً "اپنی آنکھوں کو سمجھ سے
کھولیں سیر دیا۔
"آپ ابھی تک یہیں ہیں؟" میر کو معلوم تھا کہ یہ
ایک معمولی حرکت ہے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ابھی بھی یہاں
موجود ہے۔ تب ہی تو ساڑھے سات بجے اپنے آئین واپس
آئی تھی۔ وہ آنکھیں کھولنے کے کھل ہوتی تھی فوراً
کر رہی ہے گھر ابو اور اما کے ہیں سائے آکر کھڑا ہو گیا۔
"اما تم مجھے جو سزا دیا جانتی ہو؟" میں مجھے معاف کر
و۔" وہ طنز لگاؤں سے اسے دیکھتی رہی۔
"تم سے دور جا کر مجھے بتا جا کہ تم سے دور جانا میری
زندگی کی سب سے بڑی گھٹلی تھی۔ جس طرح تم مجھ سے
محبت کرتی ہو۔" اس طرح میں بھی تم سے محبت کرنا ہوں
صرف تم سے۔"
"اور یہ محبت کتنے دنوں تک پر قرار ہے گی؟ کتنے دنوں
بعد وہ دن آئے گا جب تم مجھے چلانے کے چوڑے تم میرے
ساتھ خوش نہیں ہو۔" اس کے لیے اور کے پاس جا رہے
ہو۔ "وہ دروازے پر روراست کھڑی کھڑی طرف آئی تھی۔
کمزور اس نے اسے "تم کو تو تھا۔ اس کے لیے اس
وقت میں بہت تھا۔
"اب ایسا بھی نہیں ہو گا اما اب تم میرا اعتبار کرو۔"
"اعتبار کروں تمہارا؟ اس شخص کا جس نے میرے
بازوں کے نیچے زمین کھینچ لی اور سر کے اوپر سے آسمان
چھین لیا۔ میں مجھیں کتنی بے وقوف نظر آتی ہوں میر

اٹھا کر باوقار انداز میں کھڑی وہ اسے اپنی زندگی بے اہل جانے کو کہہ رہی تھی۔ نہ اس کے چہرے پر کوئی رنج و مال تھا نہ آنکھوں میں کوئی آنسو۔ وہ حمیرا کو آنکھوں سے ایک آنسو پکے بغیر اپنی زندگی سے وداع کر رہی تھی۔

قلب مضطرب نہر لمحہ بھر کے لیے
اس کی رخصت کا ہنگامہ درپیش ہے
وصل شیریں سے گل رنگ ماحول میں
اک کمانی کو انجاسم درپیش ہے
آخری بار کی بھرکے میں دلچسپوں
کیا خیر پھر بھی اہم ملیں نہ ملیں
شاخ فردا مہربا ہو کہ نہ ہو
کس کو معلوم پھر گل جھلکیں نہ جھلکیں
ایسی ساعت کہاں ایسا منظر کہاں
رنگ ہی رنگ ہے روپ ہی روپ ہے
چھاؤں آجیل کی لے لوں کھڑی لا کھڑی
پھر سفرد و سفرد دھوپ ہی دھوپ ہے

اس کے اور ماہ کے بیچ جو چرچا مائل ہو رہی تھی وہ اس کے آنسو تھے۔ وہ اسے دلچسپ لہنا چاہتا تھا بہت اچھی طرح مگر اس کے آنسو اس کے چہرے کو دھندلا کر کے دکھا رہے تھے۔

"اجھا میں چلا جاتا ہوں۔ پھر کبھی تمہاری زندگی میں۔" اس کا بھی نہیں۔ بس ایک بار 'صرف ایک' آخری بار جیسے اسی بار بھرے ماٹوس کے لیے میں حوی کہہ دو اور تو اس کچھ بھی نہیں مانگ رہا تم سے۔ صرف ایک چھوٹا سا ڈنڈا ماہا اسی بار سے صرف ایک آخری بار مجھے حوی کہہ دو۔" اس کے ہونٹ بے ضرورت تھے مگر ان سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی اور اگر اس کے منہ سے یہ منت بھری آواز نکلی بھی جاتی تو کیا وہ اس کی یہ خواہش پوری کرتی؟ اس سے لگاؤں ہٹا کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ اپنی زندگی کی بازاری بار کریموں سے جا رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولنے کو ہاتھ آگے بڑھایا تو اس کی کسی چھوٹے سے بچے کی طرح بیوقوفانہ گردنوں کا۔ "مجھے نہیں جانا یہاں سے۔" اس نے دروازہ نہ کھولا یا اور باہر قدم رکھنے لگا۔ "مجھے چھوڑ کر مت جاؤ حوی!" وہ خوشی سے

کرنے کے بعد اس کی طرف طنز اور حقارت سے دیکھنے لگی۔

"میں فائز عید سے شادی کر رہی ہوں حمیرا! اور تم سے جو واحد چیز میں چاہتی ہوں وہ طلاق ہے۔ امید کرتی ہوں تم مجھے خلع کی طرف جانے پر مجبور نہیں کرو گے۔" اسے لگ رہا تھا اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے ہیں۔ اپنا چہرہ گردن اور گردن سب اسے جھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ ایسا کب ہوا؟ آخر کب؟ کب وہ لڑکی محبت کرتے کرتے اس سے نفرت کرنے لگی؟ زندگی کی بازاری بار جانے والا شخص اب کیا کہے؟ وہ خاموش تھا۔ وہ اپنے کانوں سے بندے لپیکلپسی اٹارنے لگی اور سب سے آخر میں اپنی انگلی میں پتلی انگوٹھی اس نے جھنجھکرائی۔ وہ تینوں چیزیں اب اس کی منگی میں تھیں۔

"آج میں تمہارا اور اپنا ہر شے ختم کر رہی ہوں۔ ماما احمد علی اور حمیرا! جس کمانی کے دو کروا رہے 'وہ کمانی آج ختم ہوئی۔"

اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے کیا اور اس کی منگی پھیل پر وہ تینوں زور ڈال دیے تو کبھی اس نے بہت محبت سے اسے اپنے آنکھوں سے پھٹائے تھے اور جنہیں وہ کبھی خود سے جبرائش کرتی تھی۔

کمانی ختم ہو چکی؟ کیا واقعی کمانی اس طرح لمحہ بھر میں ختم ہو جاتی ہے؟ اس ایک بل میں سب کچھ ختم؟ "بب میں تم سے ہر شے ختم کر رہی ہوں تو پھر اب مجھے 'تمہیں کچھ کہنے کا کوئی حق تو نہیں ہے۔ پھر بھی بغیر کسی حق کے تمہیں ایک صحت کرنا چاہتی ہوں۔ تم دنیا میں کسی سے محبت نہیں کر سکتے تم کسی کے ہو نہیں سکتے سوائے اپنے۔ مگر اپنی بیٹی کے ساتھ وہ سلوک مت کرنا جو دو سروں کے ساتھ کرتے ہو۔ تم کسی کے نہیں ہوئے کم از کم اپنی بیٹی کے تو ہو جاؤ۔ ورنہ جس لمحہ میں آج میں تم سے بات کر رہی ہوں 'اسی میں آج سے تیس سال بعد تمہاری بیٹی کرے گی۔ پھر کیا کہو گے؟ پھر کہاں جاؤ گے؟ پھر تو تم سرائیگر زندہ رہنے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔" وہ اس کے سامنے سے بٹی اور دوہرہ قارندموں سے چلتی اپنی میز کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ "خدا حافظ حمیرا! بیٹہ کے لیے۔"

دروازے اور حمیرا کے درمیان وہی کھڑی تھی۔ درمیان سے ہٹ کر اس نے اسے جانے کا راستہ دے دیا تھا۔ سر

جے سافٹ بہت تیزی سے پلانا۔

”گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ میز کے پاس اسی سردار اور سپاٹ انداز میں کھڑی خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چلے جانے کی منتظر۔ وہ پھر دروازے کی طرف پلٹا اور یک دم اسے یوں لگا جیسے وہ بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی تھی۔ اس کے بالکل پیچھے سرکھڑی ہوئی تھی۔

”میں مذاق کر رہی تھی جو یہ کہتم نے مجھے اتنے دھکے دیے! اتنا دلایا۔ کیا میں تمہیں تھوڑا سا جھک بھی نہیں کر سکتی تھی۔ چلو ہم زندگی کو دہن سے شروع کرتے ہیں، جہاں پر ہم الگ ہوئے تھے۔“

اس بار وہ پلٹا نہیں۔ گھوم کر اس کی طرف دیکھا نہیں۔ یہ صرف دباہم ہے۔ یہ حقیقت ہو نہیں سکتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اسے اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکال رہی ہے۔

”بھئی اپنی در سہری حوی! وہ اس کے گلے میں بائیں ڈال کر مسکراتی تھی۔

ارے ہاں آج تو سولہ فردی تھی۔ اسے یاد کیوں نہیں رہا۔

”ہاں واقعی یہ تو میری غلطی ہے۔ مجھے یاد دلانا چاہیے تھا۔“ وہ شرارت سے کھکھکاتی تھی۔ اور حیرت منانے لہو سے کئی آہیں اور سسکیاں نکالتی تھیں۔

ان کی زندگی میں سب کچھ صحیح تھا۔ پھر غلط ہو گیا کہ اس سے شروع ہوا تھا۔ اس کی اپنی وجہ سے اس کی طبع اس کی حرص، اس کا لالچ۔ آسمان تک پہنچ جانے کی اس کی خواہش۔

اب کیوں نہیں ہوتے خوش؟ یا تو لیا وہ سب کچھ جو زندگی سے اپنے لیے مانا جاتے تھے۔ کیا ہوا جو اس لڑکی کو کھوایا جس کے بغیر زندگی کا کوئی مل سکھ سے نہیں دیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ زندگی کے پچھلے ساڑھے پانچ سالوں کو حرف غلط کی طرح منادے۔

ستمبر کی اس گرم دہر جب وہ اخبار اپنے سامنے پھیلائے بیٹھا تھا اور وہ اس کے بالوں میں تیل کی مالش کر رہی تھی۔ وہ نقش کش کا شکار تھا کہ ماہ سے کیسے بات کرے۔ کاش وہ پل بھر سے مل جائے وہ ماہ سے سدرہ کے بارے میں کچھ نہ کہے گا۔ اب کی بار وہ اس دن کچھ غلط نہیں ہوئے دے گا اور سدرہ اتفاق کو اگلے روز آئیں میں صاف صاف بتا دے گا کہ وہ اس سے شادی نہیں کر سکا۔

زندگی ہمیں ایک اور موقع کیوں نہیں دیتی؟

ان ہی آنسو بھری نگاہوں سے اسے آخری بار دیکھ لیے۔ بعد اس نے دروازہ بند کیا۔ یہ در آج اس پر ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا تھا۔

”کیا آج چاند گرہن ہے یا یہ اماؤں کی رات ہے؟“ وہ کھلے آسمان کے نیچے کھڑا اس غارت کو اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جس میں سے وہ ابھی باہر نکلا تھا۔

”ایسی تاریکی! اتنا کرا اندھیرا اور اسی فضا میں جیسے کسی کی موت پر لوحہ پڑھ رہی ہیں۔ کون مرا ہے آج؟“

بست در بست وہاں کھڑے ہو کر روتے رہنے کے بعد وہ اپنی گاڑی کے پاس آگیا۔

”تم نے آج پہلی بار مجھ سے کچھ مانگا ہے۔ ہمارے اتنے برسوں کے تعلق میں پہلی بار۔ میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ جو تم مجھ سے چاہتی ہو وہ میں تمہیں دے دوں گا۔ لیکن ماما اتنے برسوں میں اگر آج پہلی بار تم سے مجھ سے کچھ مانگ ہی لیا تھا تو جدلی کیوں؟ یہ اساتذہ کیوں نہیں؟“ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے بست کھلتے خوردہ انداز میں گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

وہ راستے طے کر کے گھر کس طرح پہنچا اسے بالکل پتا نہیں تھا۔ اسے بس یہ پتا چل رہا تھا کہ زندگی میں دور دور تک اندھیرا ہے۔ زندگی میں اتنی تنہا، اتنی مشقت، اتنی افزائش، اتنی چٹائی، اتنی ہوشیاری، اتنی دعا بازی کس کے لیے؟ آخر کس کے لیے؟ یہ عابدین مقبرہ کو سمجھے اور آپس بننے کے لیے؟ تنہا بیٹھ کر روئے کے لیے؟ وہ ایک بار پھر ضبط کھو بیٹھا تھا۔ مٹھیاں سمجھ کر وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ وہ بچوں کی طرح ہلکے ہلکے کر رہا تھا۔ اس عابدین محل میں آج وہ تھا تھا۔ اس کے آنسو صاف کرنے والا یہاں کوئی نہ تھا۔ آج جب اپنے دل پر چوتھی تھی تو احساس ہوا تھا کہ جن دلوں کو اس نے توڑا تھا، جن لوگوں کو اس کی وجہ سے تکلیفیں پہنچی تھیں انہیں بھی ایسا ہی درد ہونا ہو گا۔ اسے صرف اس لڑکی کا ساتھ چاہیے۔ اسے صرف ماما احمد جی چاہیے پورچ میں کوئی گاڑی اگر رکھی تھی۔ روتے روتے اس نے سرائی کر اس طرف دیکھا۔ اہل گاڑی سے اتر رہی تھی۔ جب سے وہ پاکستان آیا تھا سدرہ، اہل کوڈر ایٹور کے ساتھ اس سے ملنے کے لیے بھیج دیا کرتی تھی۔ وہ اہل کوڈر سے ملنے سے نہیں روکتی تھی۔

اہل اسے لہان میں دیکھ کر دوبارہ وار بھاگتی ہوئی اس کی طرف بھاگتی اور اس کے گلے میں بائیں ڈال دیں۔

”ہیلو پاپا! اس سے بولا نہیں جا رہا تھا درنہ ہمیشہ کئی طرح اسے سلام کی جگہ۔ ہیلو کہنے پر تو کتنا ضرور۔ ان کھوں میں اہل کا آجائنا کیسا چاہنے والا لگا تھا۔ اس کھن اور جس میں جیسے کہیں سے تازہ ہوا کا جھونکا آگیا تھا۔ میرے بیٹی کے ماتھے پر بار کیا۔

”پاپا! آپ رو رہے ہیں؟“ اہل نے اس کی ٹھوڑی پر انگلی لگاتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔

”ایک شہزادی تھی بہت اچھی بہت پیار کرنے والی۔ آج لپٹا نے اسے کھو دیا ہے بیٹا۔“ اسے اپنے ساتھ لگا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رہا تھا۔

وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف ضرور کر رہی تھی گراس کی سمجھ میں نہ باپ کی بات آتی تھی اور نہ اس کا رونا۔

”آج اس نے مجھے میری بہت بد صورت شکل دکھائی ہے۔ اہل بہت بد صورت بہت گریہ۔ میں باتوں میں اتر رہا ہوں۔ اپنی کسی کسی غلطی کو یاد کروں؟ کس کس پر روؤں؟“ وہ چار سال کی بچی جیسے جھنجھکی ان لفظوں کا مقصوم جو باپ کو کوئی اہل کوئی دلا سا ہے پائی۔

”تم کسی کے نہیں ہوئے، تم از گم اپنی بیٹی کے تو ہو جاؤ۔ اپنی بیٹی کے ساتھ وہ سلوک مت کرنا جو دوسروں کے ساتھ کرتے ہو۔“ کچھ دیر پہلے کی سنی بات اچانک اس کی سماعتوں میں گونجی۔ اس نے بھیج کر اہل کو اپنے بازوؤں میں بٹھ پائیا اور اس کے بالوں پر وہ امانت انداز میں پیار کرنے لگا۔

”تم ٹھیکہ لکھی ہو! میں صرف خود سے محبت کرتا ہوں۔ صرف اپنے بارے میں سوچتا ہوں۔ دوسروں کے احساسات تو میرے لیے کچھ معنی رکھتے ہی نہیں۔ تمہارے پاس واپس گیا تو بھی صرف اپنی خوشی کا سوچا اور اہل اپنی بیٹی اس کے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔ اسے اس کی ماں سے چھین لوں گا۔ اپنے سیاہ نامہ اقبال میں ایک اور گناہ لکھواؤں گا۔ ایک ماں سے اس کی بیٹی کو چھین کر۔ تمہارے پاس واپس گیا تو اس عورت کے بارے میں ایک پل کر رہے سوچا۔ ہو میری بوی! میری بیٹی کی ماں ہے سچی محبت کیسی تھی تو اعلیٰ طرفی اور وسعت قلبی بھی کیسی تھی۔ خود غرضی اور محبت ایک ہی دل میں ساتھ ساتھ کیسے رہ سکتے ہیں؟“

بھی مڑ کر دیکھے بھی نہیں۔

نہیں وہ ماما، تم علیٰ امتی خود غرض کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ اہل سے اس کا گھر کیسے چھین سکتی ہے۔ وہ معصوم نہیں جس نے انہی دنیا میں کچھ بھی نہیں دیکھا، وہ اس سے اس کا گھر چھینے کا اس سے اس کا باپ چھیننے کا ظلم کیسے کر سکتی ہے۔ ”آج تمہارے بابا کو جو کچھ کما، جتنی نفرت کا اظہار کیا، جتنے برباد افغان جنگیال کے اور اسے مایوس لوٹنے کو جو فائر عبید سے شادی کا فیصلہ کیا، سب تمہاری وجہ سے کیا ہے۔ اہل ملکہ نہیں ہوں تو کیا ایک مٹا بھرا دل بھی نہیں ہے میرے سینے میں؟ میں نے تمہارے بابا کو واپس تمہارے پاس بھیج دیا ہے اہل۔ میں نے تمہارا گھر ٹوٹنے سے بچایا ہے اہل، تم بابا بیسی بن جاؤ۔ تم ایک لڑکچہ رشتوں اور رشتوں کی تلاش میں ویران نہیں پھرو گی۔ رشتے نہیں بھونڈنے نہیں پڑیں گے، وہ تمہارے پاس موجود ہوں گے۔

وہ کھڑی کھول کر کھڑی ہوئی تھی اور باہر اندھیرا ہونے کے باوجود اسے پیچھے ملے آسمان تک وہ شخص کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اندھیرے میں اس کی شکل صاف نظر نہیں آ رہی تھی تو اس کے آنسو سے نظر آتے۔ مگر وہ پھر بھی یہ بات نہ مانتی تھی کہ وہ گاڑی سے پاس ہڑا رہا ہے۔

”تمہیں اپنے دل کی بات بتاؤں گا، جس روز وہ واپس آئے گا۔“ وہ گاڑی کی کاپٹ پڑ کر زار و قطار رو پڑی۔ وہ واپس آنے والا واپس جانے والا تھا۔ اسے جانے کو خود ہی کہا تھا، مگر اب اسے جانے دیکھنا اپنی بہت اور حوصلے سے بہت زیادہ لگ رہا تھا۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ آٹھ سال قبل سولہ فروری کو چڑنے والا ایک رشتہ سالہ فروری ہی کو نوٹ بھی گیا تھا، چاس سو پتیاں، ایک برسات میں گی گئے؟“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں بہت بڑا سا ایک بیک کروں گی۔ اتنا بڑا کہ اس پر چاس سو پتیاں لگائی جا سکیں۔“

”بہت جلدی ہے، چھ سال گزر جائے گی، اس کی گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ اس کے اہل سے ایک تم نکلے۔ ایک سسکی۔“

”مندی میں پھر اسے نکالنے کو تھا۔ اس نے اپنے ہلوں پر ہاتھ رکھ یا۔ وہ روئے ہوئے دیکھ رہی تھی کہ اس کی گاڑی ٹیٹ سے باہر نکل چکی تھی۔“

”میرے اللہ..... یہ شخص ہمیشہ خوش رہے، ہمیشہ سسکی رہے، تو اس کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دینا۔ میرا کوئی حق اس کے اندر نہیں۔ میں

اپنا ہر حق اسے معاف کر لی ہوں۔ میں نے اسے معاف کر دیا تو ابھی اسے معاف کر دے۔ اس سے کوئی قصہ حساب مت لینا۔ اسے کوئی سزا مت دینا۔ اس دنیا میں نہ کل روز حشر میں۔ اس پر رحم فرما میرے اللہ۔ اس پر رحم فرما۔“ روتے ہوئے کلیپاتے ہوئوں سے وہ اندھ پکار رہی تھی۔

بہت دیر تک وہ رو رہی رہی۔ اس شخص کے لیے اس کی ان یادوں کے لیے جو بھی اس کی تھیں۔ وہ آج انہیں آخری بار یاد کر رہی تھی تاکہ کل جب وہ فائر عبید کے ساتھ اپنی نئی زندگی شروع کرے تو اپنی سوچوں اور اپنی یادوں میں بھی اس کی رفتار ہو کر دے سکے۔ اس کا دل یہ سوچ کر مضطرب تھا کہ اس نے فائر سے محبت کا کوئی جھوٹا اظہار نہیں کیا۔ وہ اپنی نئی زندگی کا آغاز کسی جھوٹ کے ساتھ نہیں کرے گی۔

وہ اس کا محض دوست پورے یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی دوستی خود بخود محبت میں بدل جائے گی۔ محبت کا تو پتا نہیں مگر اس کے ساتھ انتہائی حدوں تک محض اور وفادار وہ مرتے دم تک رہے گی۔ وہ اپنی یادوں اور اپنے خیالوں میں بھی سمجھی اس سے۔ وفا کی باتیں کرے گی۔ فائر کے دل پر زار کی بے وفائی کا ہونا۔ زخم نکالتے۔ وہ اس زخم کو اپنے پیار اور اپنی توجہ سے بہت جلدی بھر دے گی۔

اس نے زندگی میں بہت سے خواب دیکھے تھے۔ ایک گھر کے رشتوں کے محبت کے۔ اس کا صرف محبت کا خواب ہی تو نوٹ کر نکلا ہے، باقی سارے خواب تو ابھی سلامت ہیں۔ اپنے ایک گھر کا خواب، اپنا کہہ سکے والے کچھ رشتوں کا خواب اور سب سے بڑھ کر اسے ”ماما“ کہہ کر بلانے والے ایک شخص سے وجود کا خواب۔ اسے اپنے ان سارے خوابوں کی تعبیریں حاصل کرنی تھیں۔

اس نے اپنے چہرے پر سے سارے آنسوؤں کو مٹا دیا پھر برس کندھے پر ڈال کر وہ اپنے آنسو سے باہر نکل آئی۔ وہ صرف جس سے نہیں نکلی تھی، وہ یادوں کے حصار سے بھی نکل آئی تھی۔ وہ زندگی کو ایک نیا عنوان دینے پر تھی اور اس نئے عنوان میں وہ بیٹھ کر کل کا کوئی دن یاد نہیں کرنا چاہتی تھی۔